[illegible]

بلوچی رزمیہ شاعری

گل خان نصیر

بلوچی اکیڈمی۔ کوئٹہ

جملہ حقوق بحق بلوچی اکیڈمی کوئٹہ محفوظ

بار اول — مئی ۱۹۷۹ء

تعداد — ایک ہزار

پرنٹر — قلات پرنٹنگ پریس کوئٹہ

پبلشر — بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

قیمت — 120 [redacted] روپے

تعارف

یہ ایک روایت سی بن گئی ہے کہ زیور طبع سے آراستہ ہونے والی ہر تصنیف کے بارے میں مقدمہ، دیباچہ، پیش لفظ، اور تعارف وغیرہ کے عنوان سے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس روایت کی پیروی کرتے ہوئے میں نے عنوان کا انتخاب تو تعارف کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک مصنف یعنی میر گل خان نصیر نہ تو شخصی طور پر کسی تعارف کے محتاج ہیں اور نہ ہی بحیثیت شاعر و ادیب۔ انہیں صرف اہل پاکستان ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی اہل سیاست و اہل دانش بخوبی جانتے ہیں۔ جس طرح وہ ذاتی اعتبار سے گوناگون خصوصیات کے حامل ہیں۔ اسی طرح شعر و ادب کے میدان میں بھی نہایت ہی پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں۔ ذاتی کردار اور ادبی تخلیقات کے مختلف رویوں کو دیکھتے ہوئے وہ بعض اوقات مجموعہ اضداد بھی دکھائی دیتے ہیں۔ چونکہ مجھے ایک طویل عرصے سے مصنف کے ساتھ ایک نیاز مند کی حیثیت سے

بے تکلفی کی حد تک قربت کا شرف حاصل رہا ہے اس لئے ان کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے ہے جس میں اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ بہر حال کتاب ہذا کے مصنف میر گل خان نصیر کا اگر مکمل تعارف کرایا جائے تو اس کے لئے بجائے خود ایک کتاب تصنیف کرنے کی ضرورت ہوگی۔ میں یہاں صرف وجۂ تصنیف کے بارے میں کچھ عرض کرنے پر اکتفا کروں گا، جو یوں ہے کہ میر صاحب ۱۹۷۲ء میں کالعدم نیپ اور جمعیت العلمائے اسلام کی متحدہ حکومت میں صوبہ بلوچستان کے وزیر تعلیم تھے۔ ۱۹۷۳ء میں پیپلز پارٹی نے جو مرکز اور پنجاب و صوبہ سندھ میں بلا شرکت غیرے برسر اقتدار تھی سیاسی چپقلش کی بنا پر بلوچستان کی نمائندہ حکومت کو برخواست کر دیا۔ جس پر بطور احتجاج صوبہ سرحد کی حکومت مستعفی ہو گئی۔

۹ جون ۱۹۷۳ء کو میر گل خان کو بعض الزامات کے تحت گرفتار کر کے ۲۶ جون تک کوئٹہ چھاؤنی کی حوالات میں رکھا گیا، اور اس کے بعد مچھ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ قید تنہائی کی کرب ناک اور طویل گھڑیوں کو گذارنے کیلئے انہوں نے زیر تعارف کتاب کا آغاز کر دیا۔ کچھ مواد ان کے سینے میں محفوظ تھا اور کچھ مخطوطہ و مطبوعہ صورت میں انہیں میسر آگیا۔ جس کو سامنے رکھ کر انہوں نے اس تصنیف کو چند مہینوں کی مختصر مدت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا کر نہ صرف بلوچی دانوں کے لئے بلکہ اردو جاننے والے ان اہل دانش کے لئے بھی ایک بیش بہا ادبی سرمایے کا اضافہ کر دیا۔

مصنف سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس
تصنیف کا آغاز مچ جیل کے چیچک وارڈ میں ۲۴ر جولائی ۱۹۷۳ء کو ہوا
اور وہیں پر ۲۷ر دسمبر ۱۹۷۳ء اختتام پذیر ہوا۔ کتاب کا تعارف اس
کے نام سے ظاہر ہے۔

اخیر میں یہ عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ مصنف جیل کی سلاخوں
کے پیچھے بیٹھ کر جن حالات کے تحت رہوار قلم کو جنبش دے رہے
تھے۔ بالکل وہی حالات اس وقت بلوچستان کے لق و دق
صحراؤں اور اونچی نیچی گھاٹیوں میں بھی عملی طور پہ کار فرما تھے
وہ خود اگرچہ جیل میں مقید تھے لیکن ان کی روح اپنے ان ساتھیوں اور
خویش و اقارب کے ہمراہ بھٹک رہی تھی جو ناگفتہ بہ مظالم کا شکار ہو
رہے تھے۔ اس لئے اگر کوئی قاری مصنف کے لہجے میں کہیں پر کسی قسم
کی تندی و شوخی محسوس کرے تو بیان کردہ پس منظر کو بھی ذہن
میں رکھے۔

بہرحال مصنف نے پہلی بار اس موضوع پر جتنا کچھ لکھا ہے
وہ حرف آخر تو نہیں ہے لیکن ایک ایسی کاوش ضرور ہے جس
سے اہل علم حضرات اس وقت تک بھرپور استفادہ کرتے
رہیں گے۔ جب تک کہ کوئی اور اہل قلم اس دشوار کام میں آگے
قدم نہیں بڑھاتا۔

۲ر مئی ۱۹۷۹ء
محمد پناہ ۔ وائس چیئرمین
بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

پہلا باب

بلوچستان، بلوچ اور بلوچی

۱۔ بل دیوتا کی پرستش کرنے والوں کی اس سرزمین نے جو بلوچستان کہلاتا ہے اور جس کا ایک حصّہ آج پاکستان میں شامل، اور صوبہ بلوچستان کے نام سے مشہور ہے اپنی سنگلاخ وادیوں، بے آب وگیاہ صحراؤں اور لق ودق میدانوں میں ایک قدیم تہذیب وتمدن کے آثار کو پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ ایران کا جنوب مشرقی حصّہ سیستان سے کرمان کو مغرب میں چھوڑتے ہوئے بندر عباس تک جو کوہستانوں، سرسبز وشاداب وادیوں اور پہاڑی ندی نالوں سے پٹا پڑا ہے۔ اسی سرزمین کا ایک حصّہ ہے، جہاں پر بل دیوتا کے پرستاروں نے کسی زمانے میں عظیم زرتشت کے اقوالِ زریں کو سُنا اور ان کی صداقت کو تسلیم کیا تھا۔

افغانستان میں دریائے ہیلمند جہاں گرمسیل کے حدود میں داخل ہوتا ہے اور وہ دشت وصحرا جن کی پہنائیاں پاکستان اور ایران کی حدود کو چھوتی ہیں اسی سرزمین کے حصّے ہیں۔ اس سرزمین کے قدیم باشندے اپنا ایک ترقی یافتہ معاشرہ رکھتے تھے۔ اور جو بل یعنی سورج دیوتا کے پرستار ہونے کی مناسبت سے بلکوش، بلکوچ، بلوص اور براج کہلاتے تھے، یہ لوگ اس زمانے میں بھی جس کے بادشاہوں اور پہلوانوں کے ذکر سے فردوسی کا شاہنامہ مزیّن ہے اسی سرزمین پر آباد تھے۔

فاروقی میں جب ابوموسیٰ اشعری نے خوزستان پر لشکر کشی کی تو اس وقت ہرمزان کے پاس بلوچوں کی ایک جرّار فوج تھی اور جس کی کمان "سیاہ بچ" یا "سیاہ بلوچ" نامی ایک دلیر اور ہوشیار بلوچ سردار کے ہاتھ میں تھی اس موقع پر کسی وجہ سے سیاہ بچ بلوچ کو ہرمزان نے قید کر رکھا تھا خوزستان پر جب عربوں نے حملہ کیا تو ہرمزان نے سیاہ بچ کو رہا کرتے وقت یوں نصیحت کی :ے

تو بودی بلوچے نشستہ بہ راغ !
ز چشمت جہاں دیدہ بود ونہ باغ
تنت رنجہ از باد سوزان ہند
دو دیدہ پر از خون چو دریائے ہند
ز کرمان من آوردمت پیش شاہ
نہادم بہ سر ترک و بر ترک ماہ
بدی کار اہرمن است اے سیاہ
تو از او مشو پیرو دین و راہ
اگر مردی داری و دارائی ہوش
بہ کردار بد تاتوانی مکوش

چنانچہ سیاہ بچ کو رہا کرکے بلوچ فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں دی گئی۔"

بعض مورخ اس بلوچ سردار کا نام "سیاہ بوش" بتلاتے ہیں۔ سیاہ اور سیاہی بلوچوں کے عام نام رہے ہیں۔ رئیس سیاہی جس سے بلوچوں کا رئیسانی قبیلہ منسوب ہے بلوچستان کی ایک اہم شخصیت گذرے ہیں ۔

فارسی زبان کا مشہور عالم اور عظیم رزمیہ گو شاعر فردوسی اپنے شاہنامہ میں بلوچوں سے متعلق کہتا ہے کہ ایک دفعہ انوشیروان (خسرو پرویز) بادشاہ نے بلوچوں کی بیخ کنی کرنے کیلئے کوہ البرز کو اپنی سپاہ سے گھیر لیا اور اعلان کر دیا کہ :-

منادی گرے گردِ لشکر بگشت
خروش آمد از کوہ واز غار و دشت
کہ ہرگز بلوچے بیابند خورد
چہ از تیغ داران مردانِ گرد
دگر انجمن باشد از اندکے
نہ باید کہ یابد رہائی یکے!

نظم طویل ہے، مختصر یہ کہ اس لوٹ مار اور قتلِ عام کے باوجود انوشیروان بلوچوں کی بیخ کنی میں کامیاب نہیں ہو سکے، بلکہ کچھ عرصہ بعد فردوسی ہمیں بتاتا ہے کہ اسی نوشیروان نے بلوچ بہادروں سے اپنی سپاہ کو آراستہ کرنا شروع کیا، اور جب خاقان چین کے سفیر کا شاہانہ استقبال کیا گیا تو اس سپاہ تشریفات میں گیلانیوں کے ساتھ سنہری ڈھالوں سے مسلح بلوچ بھی شامل تھے۔

اسی ضمن میں بلوچ مؤرخ غلام محمد نوردین اپنی کتاب "بلوچ و بلوچستان کا تاریخی جائزہ" میں لکھتا ہے کہ عرب حملہ آوروں سے قبل کرمان، خوزستان اور فارس کے بعض دوسرے جنوبی اور جنوب مشرقی علاقوں میں بلوچوں کی آبادی عہدِ ہرمزان کے اس واقعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے، جس کا بیان فردوسی شاہنامے میں کرتا ہے، عہد

غرضیکہ بلوچ اس وقت بھی جبکہ ہندوستان کے مہاراجا اشوک سریر آرائے سلطنت تھے اس سرزمین پر آباد تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب اس اقلیم میں مہاتما بدھ کی پرستش ہوتی تھی۔ آج بھی بلوچستان میں قدم قدم پر مہاتما بدھ کے آثار ملتے اور اس عہد کی داستانیں سناکر تازیانۂ عبرت کا کام دیتے ہیں۔

زاں بعد وہ دور بھی آیا جب ایران کو تاخت وتاراج کرنے کے بعد عرب مجاہدینِ اسلام نے اس سرزمین کا رخ کیا اور پھر ایک طویل جد وجہد اور قتل ومقاتلہ کے بعد کلدانیوں کی اس قدیم نسل کو دینِ اسلام سے مشرف کیا۔ پھر مغل آئے اور اُن کے بعد انگریز جہانگیروں نے اس سرزمین کو اپنی عظیم الشان سلطنت میں شامل کرکے ستر سال تک اس پر حکومت کی لیکن بلوچوں کی قومیت، رسوم ورواج اور زبان کو مٹانے، اور ختم کرنے میں ان کو بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

حاصل کلام یہ کہ اُس زمانۂ ماقبل التاریخ سے جبکہ بلوچ بل دیوتا کے پرستار تھے اس دور تک جبکہ بلوچ مشرف بہ اسلام ہوئے اور پھر انگریز کے دورِ غلامی سے اب تک بلوچ بدستور اسی سرزمین پر آباد چلے آتے ہیں یہ سرزمین جو ان کے نام کی مناسبت سے بلوچستان کہلاتی ہے انکی مادر بھومی یا مادر وطن ہے۔

○ اُن آثار قدیمہ کی رو سے جو بلوچستان کی سرزمین سے برآمد ہوئے ہیں، اُن تاریخی شہادتوں کی بنا پر جو اب تک دستیاب ہوئی ہیں اور اس زبان کی مناسبت سے جو یہ قوم بلوچ اب تک بولتی ہے اور جس کا سراغ زرتشت کی آفاقی کتاب "آوستا" اور کتباتِ بہستون" میں ملتا ہے یہ تسلیم کرنا

پڑے گا کہ بلوچ اس سرزمین پر آباد ایک قدیم قوم اور بلوچی ایک قدیم ترین زبان ہے۔ اس ضمن میں مسٹر لانگورتھ ڈیمز کہتا ہے کہ:

"بلوچ اپنے ساتھ ایک قدیم فارسی الاصل زبان لائے ہیں، جس کی علامتیں مغربی فارسی کی بجائے قدیم باختری زبان سے لی گئی ہیں اور اُسے ایک ایسے علاقہ میں پھیلایا ہے جسے زمانہ قدیم میں بھی ایران کا نہیں بلکہ ہمیشہ ہندوستان کا حصہ خیال کیا جاتا تھا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج جو بلوچی بولی جاتی ہے وہ خالص نہیں اس میں اور اُس بلوچی میں جسے آدستاکی زبان کہا جاتا ہے بہت بڑا فرق ہے اس لئے کہ اس پر کئی ہزار سالوں کا عرصہ گذر چکا ہے، فارسی جو اس سے صدیوں بعد عالم وجود میں آئی اور جلیل القدر شہنشاہوں کی زیر سرپرستی پروان چڑھتی رہی آج وہ بھی زبان نہیں رہی جو کیخسرو دکیاؤس کی زبانوں میں تھی۔ تب بلوچی جو خود رو اور جنگلی جڑی بوٹیوں کی طرح پھیلتی رہی۔ زمانے کے تغیرات سے کیسے محفوظ رہ سکتی تھی، یہی غنیمت ہے کہ اُن بڑے بڑے تہذیبی اور معاشرتی انقلابوں کے باوجود جو سرزمین ایشیا میں وقتاً فوقتاً نمودار ہوتے رہے اور یہاں کے تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی آثار کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے رہے، بلوچی زبان اپنے وجود کو قائم رکھ سکی۔ اس سے جہاں بلوچی کی قدامت، پختگی اور گیرائی کا ثبوت ملتا ہے، وہاں بلوچ قوم کی سخت جانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ماہرین السنہ کی رائے میں بلوچی خاندانی لحاظ سے ایک آریائی زبان ہے۔ قدیم بلوچی میں جہاں آدستائی زبان ژند کے آثار ملتے ہیں وہاں اسمیں سنسکرت، ہندی، دراوڑی اور کوشانی زبانوں کی حدیں اگر ایک طرف وسط ایشیا

کی مملکتوں سے ملتی ہیں تو دوسری طرف ہندوستان سے بھی اس کی حدود ملتی ہیں، لہذا ہمسایہ زبانوں سے اس کا اثر پذیر ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

اس ضمن میں ڈیمز کہتا ہے:

"بلوچی جیسا کہ مشہور ہے ایک ایرانی بولی اور جدید فارسی سے زیادہ قریب ہے مگر ساتھ ہی ساتھ بلوچی کئی نکات میں قدیم فارسی کی بجائے ژند یا قدیم باختری زبان سے بھی ملتی ہے۔ بلوچی اگر اپنی فرہنگ میں ایک طرف فارسی سے متاثر ہے، تو دوسری طرف سندھی، سرائکی جیسی ہندوستانی بولیوں سے بھی الفاظ کی ایک بہت بڑی مقدار مستعار لے چکی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ ہمسایہ زبانوں مثلاً فارسی، سندھی اور ہندی نے بلوچی پر کافی اثر ڈالا ہے لیکن خود بلوچ نے اپنے رسوم ورواج اور معاشرہ میں اپنی ہمسایہ اقوام سے کوئی نمایاں اثر قبول نہیں کیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ غالباً بلوچوں میں منافرت اور قومی عصبیت کی شدت ہے گو کہ اس مربوط سرزمین پر آباد بلوچوں کی تعداد کم وبیش ڈیڑھ کروڑ ہے۔ وہ جفاکش اور جنگجو بھی ہیں، اور ایسے بہادر کہ بقول فردوسی سے

کسے در جہان پشت ایشان ندید
ز آہن یک انگشت ناپدید

یعنی جہان میں کسی نے ان کی پیٹھ (میدان جنگ) میں نہیں دیکھی۔ وہ آہن پوش ایسے تھے کہ ان کی ایک انگلی بھی باہر نظر نہیں آتی تھی۔

لیکن اس کے باوجود بلوچوں نے نہ کبھی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش کی ہے اور نہ کبھی دنیاوی مال ومتاع نے اُن کا دل لبھایا ہے اس لحاظ سے بلوچ بڑے

قانع، صابر اور بے نیاز لوگ واقع ہوئے ہیں، اپنی خشک اور جھلسی ہوئی وادیوں اور دشت و بیابان میں خوش اور مطمئن رہتے چلے آرہے ہیں انہوں نے کسی چیز کی پرواہ نہیں کی ہے۔ نہ کسی بادشاہ کی قوت و جبروت سے وہ پریشان ہوئے ہیں اور نہ ہی مال و دولت کی حرص ان پر کبھی غالب آئی ہے۔ ان کے خشک و بوسیدہ پہاڑ معدنی دولت سے مالامال ہیں۔ باہر سے جو بھی آیا، ان کے ان معدنی ذخائر سے استفادہ کرتا رہا مگر بلوچ اس سے بے نیاز رہے اُن سے یہ تک بھی نہیں پوچھا کہ وہ کون ہیں اور اُن کے معدنی وسائل پر دست تصرف دراز کرنے کا انہیں یہ حق کیسے حاصل ہوا؟

بلوچستان کی سرزمین ایک وسیع چراگاہ کی حیثیت رکھتی ہے، جب موسم پر بارشیں ہوتی ہیں تو یہ دشت و بیاباں اور وادیاں لالہ زار بن جاتی ہیں۔ ہمسایہ ممالک سے خانہ بدوش مال دار قبائل ہر سال موسم سرما میں لاکھوں کی تعداد میں اپنی بھیڑ، بکریاں اور اونٹوں کے گلے لیکر یہاں وارد ہو جاتے ہیں۔ اور ان چراگاہوں کو جن پر خانہ بدوش بلوچوں کی معیشت کا دارومدار رہتا ہے چٹ کر جاتے ہیں لیکن بلوچ آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھتے ۔ گو کہ خشک سالی کے دنوں میں بلوچوں کو ان ہمسایہ ممالک میں مال چرائی کے لئے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مگر بلوچ جو روایتی طور پر جیو اور جینے دو کے اصُول کے پابند رہتے ہیں اپنے ملک میں ان سے کوئی تعرض نہیں کرتے،

بلوچ ایک طویل ساحل بحر کے مالک ہیں جس کی لمبائی کراچی سے بندرعباس تک سات سو میل ہے اور جس کا شمار دنیا میں مچھلی کی بہترین شکارگاہوں میں ہوتا ہے مسقط، ملابار، مسقط اور بحرین وغیرہ ساحلی مقامات سے ماہی گیروں کے دل کے دل اپنی کشتیوں میں یہاں آکر شکار لوٹتے رہتے ہیں لیکن بلوچ اُن سے

کوئی سروکار نہیں رکھتے۔

دریائے سندھ چالیس میل تک ڈیرہ غازی خان کے بلوچی علاقے میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ بالائی اور زیرین علاقوں میں دریائے سندھ سے نہریں جاری کی جا چکی ہیں۔ لیکن بلوچوں کا علاقہ خشک اور ویران پڑا ہوا ہے۔ مگر بلوچوں نے اب تک اپنے حاکموں سے یہ تک نہیں پوچھا کہ دریائے سندھ کے جانبخش پانی سے ان کی زرخیز زمینوں کو محروم رکھنے کے اسباب کیا ہیں؟

بلوچوں کی یہ سرشت بنی رہی ہے کہ مصائب و آلام کو صبر و سکون اور خاموشی سے برداشت کرتے رہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر قانع و شاکر رہیں۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس سرزمین پر کئی حکومتیں آئیں، اور گئیں لیکن بلوچ نے اُس سے اس وقت تک کوئی سروکار نہیں رکھا، جب تک اس کے ننگ و ناموس پر بات نہیں آئی۔ یہ اس قوم کی سرشت ہے جیو اور جینے دو کا اصول اس کی رگ رگ میں رچا بسا ہے۔

بلوچ کو جس چیز کا خیال شدت سے رہا ہے اور جس کے لئے اس نے سر دھڑ کی بازی لگانے سے کبھی گریز نہیں کیا ہے وہ اس کا لج و میار ہے ماں، بہن، بیٹی اور بیوی۔ یعنی عورت ذات کی عزت و ناموس کی حفاظت، اگر اس پر حرف آیا تو بلوچ کے لئے موت کے بغیر اور کوئی دوسرا چارہ کار باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچ شہروں اور آبادیوں پر دشت و بیابانوں میں رہنے سہنے کو ترجیح دیتا رہا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ دنیا میں صرف بلوچ ہی ایک ایسی قوم ہے جسے لج و میار عزیز ہے۔ دنیا میں ہر قوم بلکہ ہر فرد کو اپنا لج و میار پیارا ہو

البتہ کہیں برائے نام۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ یہ تفاوت ذرائع معاش اور ذرائع پیداوار کے ساتھ معاشرتی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

بلوچ چونکہ معاشرتی طور پر اب تک قبائلی دور میں پھنسا ہوا ہے جو چراگاہوں کی تلاش میں گھومتے پھرنے مال ومویشی پالنے، اور خانہ بدوش زندگی بسر کرنے کے ابتدائی قبائلی معاشرت کا دور ہے، اس لئے اس تناسب سے اس کا احساس شدید ترین ہے، اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ بلوچ ابتداء سے ہی اپنی نسل کو خالص اور پاک رکھنے کا خواہشمند رہا ہے، غیر بلوچ قبائل سے رشتے ناطے کے ذریعے رابطہ پیدا کرنے سے حتی الوسع پرہیز کرتا رہا ہے۔ اس لئے وہ عورت کے معاملہ میں انتہائی سخت گیر اور متشدد واقع ہوا ہے۔

۴۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ بلوچ ایک قدیم قوم اور بلوچی ایک قدیم ترین زبان ہے تو ہم مبالغہ نہیں کرتے بلکہ بابل اور ایرانِ قدیم کی تاریخ اور آثار قدیمہ کی روشنی میں ہم صرف ایک حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں، مگر چونکہ اس وقت ہمارا موضوع بلوچوں کی قدیم تاریخ نہیں بلکہ بلوچی شاعری اور بالخصوص رزمیہ شاعری کو پرکھنا ہے، اس لئے ہم مزید تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتے اور اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ ایشیا کی مربوط سرزمین جو بلوچستان کہلاتی ہے اس پر پشت ہا پشت سے بلوچ آباد چلے آرہے ہیں۔ یہی ان کا آبائی وطن ہے۔ اور یہ کہ بلوچوں کی اپنی ایک قابل فخر تاریخ ہے۔ اپنی ایک فصیح وبلیغ زبان ہے جو اُن کے نام کی مناسبت سے بلوچی کہلاتی ہے۔

بابل سے منتشر ہونے کے بعد چونکہ اب تک بلوچ اپنی ایک آزاد اور متحدہ قومی حکومت نہیں بنا سکا ہے اور عظیم حملہ آوروں اور مطلق العنان بادشاہوں کے ظلم وستم اور لوٹ مار سے پناہ حاصل کرنے کی جدوجہد

میں خانہ بدوش زندگی پر مجبور رہا ہے۔ اس لئے اپنی زبان کی ساخت و پرداخت کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکا۔ اور نہ ہی اُسے ایسے ذرائع میسر آسکے ہیں جن سے کام لے کر وہ اپنی زبان کو زیور تحریر سے آراستہ و پیراستہ کرسکتا۔ اس کے باوجود اس کی بلوچی زندہ اور اس کی تاریخ کے اہم ترین واقعات کو عشقیہ اور رزمیہ (بلوچی اصطلاح میں رنگی اور جنگی) نظموں کی صورت میں اپنی وسیع آغوش میں سمائے ہوئے ہے۔

بلوچی کی ان کلاسیکی نظموں کا ایک حصہ ان سرداروں، جانبازوں بہادروں اور عاشق مزاج نوجوانوں کی تصنیف ہے جو خود ذاتی طور پر ان لڑائیوں اور حملوں میں شامل رہے ہیں۔ یا ان واقعات کا کردار اور قلبی واردات کے پیکر رہے ہیں۔ اور دوسرا بیشتر حصہ بلوچ قبائل سے تعلق رکھنے والے ان موروثی شاعروں کی تصنیف ہے۔ جو عرف عام میں زنگی شاہی کہلاتے ہیں۔

ابتدائی قبائلی دور میں زنگی شاہی بلوچوں کا صاحب فن دانشور اور شاعر طبقہ تھا۔ بلوچی زبان ان کے گھر کی لونڈی تھی، بلوچی زبان اور بلوچوں کی تاریخ کو ہزارہا سال سے قائم رکھنے میں اس صاحب فن طبقے کے بلوچوں پر عظیم احسان ہیں، بلوچی شاعری، کیا رزمیہ اور کیا بزمیہ و عشقیہ اسی طبقے کی مرہون منت ہے۔ بلوچی زبان آج جس فصاحت و بلاغت کی دعویدار ہے وہ اسی زنگی شاہی طبقہ کی قوت فکر و نظر اور ذہنی فراست کی مظہر و پیداوار ہے۔ زنگی شاہی ناخواندہ ہونے کے باوجود فکر رسا رکھتے تھے۔ اور ادراک و فہم کے لحاظ سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا، گو کہ بلوچوں کے قبائلی معاشرے میں اُن کو وہ مقام حاصل نہیں تھا جس کے وہ مستحق تھے، مگر اس کے باوجود ان کو قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، بلوچوں کا قبائلی معاشرہ ان سے بے نیاز

نہیں رہ سکتا تھا۔

زنگی شاہی نہ صرف بزم و شادمانی کی محفلوں میں شمع محفل تھے، بلکہ رزم کے میدانوں میں بھی وہ اپنے قبائلی لشکر کے ساتھ رہ کر اپنے شمارے اُن کے لئے تقویت قلب کا باعث ہوتے تھے قبائل کے نڈر رزمجو نوجوان اگر میدان جنگ میں تلوار چلا کر اپنی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھاتے، تو یہ صاحب فن شاعر اُن کی جانبازی و سرفروشی کا آنکھوں دیکھا حال گوہر الفاظ میں پرو کر ان پر نچھاور کیا کرتے تھے اُن کے یہ اشعار قبائلی جنگوں کی مستند تاریخ کا کام دیتے، نوجوانوں کو اُبھارتے آئندہ نسلوں کا دل گرماتے، اور تلواروں کی جھنکاریں اُنہیں سروں سے کھیلنے کا شوق دلاتے رہتے تھے، زنگی شاہی صرف شاعر نہ تھے، بلکہ قومی ان پر کٹ مرنے کیلئے بلوچوں کی خوابیدہ اُمنگوں کو بیدار کرنے، قبائلی اتحاد کو تقویت پہنچانے اور تاریخ کو جلا بخشنے والے صاحب فن استاد بھی تھے،

۵۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں بلوچی علمی نقطہ نظر سے تحریری زبان کبھی نہیں رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بلوچی میں عشقیہ، رزمیہ اور بزمیہ اشعار کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ملتا ہے، جو اس قوم کی صدیوں کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اور سینہ بسینہ چل کر ہم تک پہنچا ہے۔

میکسم گورکی کہتا ہے:

"اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی زبان کا ادب معدودے چند دانشوروں اور ادیبوں کی رشحات فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا، کیونکہ صرف کچھ لکھے پڑھے لوگ کوئی زبان تخلیق نہیں کر سکتے، زبان کے خالق عوام ہوتے ہیں اس لحاظ سے

ادب بھی عوام ہی سے بنتا ہے۔ اجتماعیت ہی بہترین ادب تخلیق کرتی ہے۔ گر غور سے دیکھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ دُنیا کے تمام ادبی شہ پارے اجتماعیت کی پیداوار ہیں۔ عوام کا اجتماعی عمل ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو ایسے ادبی شاہکار پیدا کرتا ہے جسے ہم عوامی ادب کہتے ہیں۔ عوام مختلف کہانیاں، گانے اشعار کہاوتیں، محاورے، استعارے اور داستانیں تخلیق کرتے ہیں اس مواد سے کام لے کر ہی شاعر کوئی شاہکار تخلیق کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فن کا اظہار فرد کے ذریعے سے ہوتا ہے لیکن اس کی تخلیق کا سہرا عوام کے سر ہوتا ہے۔ صرف ایک فرد چاہے وہ کتنا بڑے سے بڑا ادیب اور شاعر کیوں نہ ہو اس کی تخلیق الفاظ کے ایک بے جان مرقع سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوگی۔

بلوچی ادب کو، جس کا واحد نمونہ ہمارے پاس بلوچی شاعری میں موجود ہے، اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے تو بلا مبالغہ اس کا شمار دنیا کے بہترین عوامی ادب میں کیا جا سکے گا۔

اقوام عالم کی ادبی تاریخ کے جائزہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر قوم کی ادبی زندگی کی ابتدا شعر و شاعری سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ شاعری فطرت سے زیادہ قریب اور اظہارِ جذبات کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتی ہے۔ انسان کی ابتدائی زندگی میں جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے تخیل کا عنصر غالب رہا ہے تخیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے اور تخیل ہی شاعری ہے۔ علامہ شبلی کہتے ہیں کہ:۔

"علمائے ادب کی رائے میں شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔

محاکات اور تخئیل، کسی موزون کلام میں اگر ان میں سے ایک بات بھی
پائی جائے تو وہ شعر کہلانے کا مستحق ہوگا، باقی اور اوصاف یعنی
سلاست صفائی، حسن بندش اور طرز ادا وغیرہ شعر کے اصلی
اجزا نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔"

محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ تخئیل کی تعریف ہنری لوئیس نے یہ کی ہے کہ:

"وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیاء کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں، ہماری نظر کے سامنے کر دے۔"

"اگرچہ محاکات اور تخئیل دونوں شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہے، محاکات میں جو جان آتی ہے تخئیل ہی سے آتی ہے۔ ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں قوت محاکات کا یہ کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے اس کو الفاظ کے ذریعے بعینہ ادا کرے لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا، تناسب و توافق کو کام میں لانا، ان پر آب و رنگ چڑھانا قوت تخئیل کا کام ہے۔"

جب ہم کہتے ہیں کہ شاعری دراصل تخئیل ہے تب ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے جو بعض انسانوں کو مہد سے ہی ودیعت ہوتی ہے، ایک خاصیت ہے جو ذہنی بلوغت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہتی ہے۔ انسانی ذہن کا ایک ایسا کرشمہ ہے جسے کسی خاص قسم کی تعلیم و تدریس

کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ہم بلوچ ساربانوں، چرواہوں اور ایک لحاظ سے جاہل محض افراد کو دیکھتے ہیں جو روانی کے ساتھ ایسی نظمیں اور اشعار کہہ لیتے ہیں ادھ

صد دانا دراو حیران بماند

اس میں شک نہیں کہ علم سے شاعری کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس کے بعض عمیق گوشے نمایاں اور اُجاگر ہوتے ہیں۔ ذاتی تجربات اُسے جلا بخشنے اور اسکی گہرائی و گیرائی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں لیکن وہ ان چیزوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ ان سے بے نیاز رہ کر بھی فہم و فکر کی بلندیوں تک پہنچ سکتی ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلی کہتے ہیں:۔

"شاعری ایک آگ ہے جو خود مشتعل ہوتی ہے، ایک چشمہ ہے جو خود اُبلتا ہے، ایک برق ہے جو خود کوندتی ہے، صلہ و انعام اور داد و دہش سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

مولانا حالی کہتے ہیں:۔

"شعر کا اثر عقل کے ذریعے سے نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعے سے اخلاق پر ہوتا ہے۔" اور یہ کہ "شاعر اپنے شعور کے ذریعے بہت کم شعر کہتا ہے بلکہ وہ زیادہ تر اپنے نفس کو خیالات و تصورات اور واردات قلبی کے حوالہ کرتا ہے۔"

شاعری کی ایک دوسری صورت سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے۔ اسے ہم تقد بند شاعری کا نام دیتے ہیں۔ یہ ان صاحب علم حضرات کی شاعری ہوتی ہے جو محض اپنی علمی قوت سے شعر گوئی کرتے ہیں اور بسا اوقات

ـدپایہ اشعار کہتے ہیں۔ ردیف، قافیہ اور علم عروض میں انہیں عبور حاصل
ـاہے۔ اپنے عالمانہ خیالات، قلبی واردات اور مجازی کیفیات کو شعر کا
ـر پہنا کر ایک خوبصورت اور دلپذیر پیرائے میں اسے بیان کرنے پر قدرت
ـصل کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری علمی نقطہ نظر سے شاعری ضرور ہے کیونکہ
ـعری سے متعلق علمارادب نے فتویٰ دے دیا ہے۔ کہ:۔ "کلام موزون ہو،
ـتکلم نے بہ ارادہ موزون کیا ہو"۔ یا جیسا کہ نظامی عروضی سمرقندی نے
ـہے کہ:۔

"شاعری اس کا نام ہے کہ مقدماتِ موہومہ کی ترتیب سے اچھی
چیز کو بدنما اور بری چیز کو خوش نما ثابت کیا جائے جس سے
محبت وغضب کی قوتیں مشتعل ہو جائیں"۔

ـولانا حالی کا یہ کہنا کہ:۔

"شعر شاعر کے دماغ سے ہتھیار بند نہیں کودتا، بلکہ خیال کی
ابتدائی ناہمواری سے لے کر انتہا کی تنقیح و تہذیب تک
بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں۔ جو کہ اب سامعین کو
محسوس نہ ہوں، لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں"۔

علمائے ادب کی رائے مقدم ہے ہم اس سے انکار کی جرأت نہیں
ـسکتے لیکن ایسا شعر جو شاعر کے دماغ سے ہتھیار بند نہ کودے اس پایے
ـکا نہیں ہو سکتا، جسے الہام کہا جا سکے، اور نہ ہی وہ شاعری ایسی شاعری
ـہمپایہ ہو سکتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

شاعری جزویست از پیغمبری۔

۶۔ بلوچی کی قدیم کلاسیکل شاعری سادہ، پرجوش اور حقیقت پر مبنی ہوتی تھی، اس لئے کہ ان کی زبان خالص اور ملاوٹوں سے پاک تھی۔ شاعری کا دارومدار محض واقعات کے من وعن بیان، حالات کی تشہیر اور قلبی واردتوں کے اظہار پر ہوتا تھا۔ رزمیہ اشعار وہی لوگ کہتے تھے جو بذات خود میدان جنگ میں موجود، لڑائیوں میں شامل اور حملہ کے وقت سب سے آگے ہوتے تھے، ایک بلوچ شاعر کہتا ہے:۔

شعراں ہما مرد گوشنت
وت موہری دعوا گرنت

یعنی:۔

شعر وہ جوانمرد کہتے ہیں
جو لڑائی میں آگے آگے ہوتے ہیں۔

اسی طرح عشقیہ اشعار بھی وہی نوجوان کہتے تھے جو فی الحقیقت کسی محبوبہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوتے تھے۔ فخریہ اشعار بھی وہی کہہ سکتے تھے جو خود اُن کے آبا واجداد یا قبیلہ نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہوتا تھا محض الفاظ سے کھیلنا اور جھوٹی شیخی بگھارنا ان کی عادت نہ تھی۔

مرثیہ یا موتک وہی شخص کہتا تھا جس کے دل پر واقعی کسی دوست عزیز یا کسی نامور ہستی کی موت سے چوٹ لگی تھی۔ اس میں بھی وہ حقائق کے بیان سے تجاوز نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ زنگی شاہی شاعروں کی بات دوسری تھی، وہ قبیلہ کے دکھ درد اور سرفرازی و شادمانی میں چونکہ شریک تھے اس لئے وہ ہر ایسے موقع پر قبائلی اور شخصی جذبات کی ترجمانی کرنے کا حق رکھتے تھے۔

غرضیکہ بلوچی کے کلاسیکل شعرا کی زبان سادہ، طرزِ بیان مؤثر اور مضمون حقائق کی تصویر کشی سے بہرہ ور ہوتا تھا، اس دور کے شعرا کی گفتار پر بلا مبالغہ زہیر بن ابی سلمیٰ کا یہ گفتہ صادق آتا ہے کہ " بہترین شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہیں کہ سچ کہا ہے۔"

بلوچی کی کلاسیکل شاعری کیا رزمیہ اور کیا بزمیہ، اُن کی اپنی معاشرت اور طرزِ بود و ماند کی طرح سادہ ہوتی تھی۔ زبان سلیس، رواں اور کنایوں اور استعاروں سے مبترا تھی۔ شاعر زیادہ تر چشم دید واقعات کے بیان کو ترجیح دیتے تھے، اور یہی ان کی شاعری میں جوش اور جذبات میں فراوانی کا سبب تھا۔ شاعر چونکہ اپنی مادری زبان میں شعر کہتے تھے، جس سے بقولِ مولانا حالی :-

"مادری زبان سے بہتر اور سہل تر کوئی آلہ اظہار جو خیالات کا مجموعہ ہو کبھی کسی شخص نے سرانجام نہیں کیا، مگر ایسی زبان میں جس کی نسبت اس کو مطلق یاد نہ ہو، کہ کب سیکھی اور کیونکر سیکھی اور جس کے صرف و نحو کے جاننے سے قبل وہ ایک مدت تک اس میں گفتگو کرتا رہا۔"

بلوچی کلاسیکل شاعری چونکہ واقعات کے بیان پر ہی زور دیتی ہے اس لئے اس میں بقول مولانا حالی :-

"مضمون آفرینی اور بلند پروازی کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ مطالب اس صفائی سے ادا کئے جائیں کہ اگر ان ہی مطالب کو نثر میں بیان کیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ واضح

اور صاف و مربوط نہ ہو البتہ نظم کا بیان نثر سے صرف اس قدر ممتاز ہونا چاہیے کہ نظم کا طرز بیان نثر سے زیادہ مؤثر، دلکش اور دلآویز ہو۔

بلوچی کلاسیکل شاعری صحیح معنوں میں عوام کی شاعری تھی۔ ان کے اشعار میں آج بھی عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ان کی تازگی اور شگفتگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنی شبینہ محفلوں میں اب بھی بلوچ ان نظموں کو گاتے، مسرت، روحانی فرحت اور قلبی تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔ ان اشعار میں بلوچوں کے دلوں کے تار چھیڑنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ان کا ہر ایک مشعر شاعر کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ چونکہ وہ ایک غیور بلوچ کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے آج بھی دل پر اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ جس طرح آج سے صدیوں قبل اثر انداز ہوا کرتا تھا۔ بلوچی شاعری کی یہی وہ صفت ہے جس نے اسے ابدیت بخشی ہے۔ ہر سنجیدہ بلوچ اسے اپنا قومی فریضہ سمجھتا ہے کہ ان اشعار کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں یاد کرے، گائے اور اپنی قومی عصبیت کو زندہ و تابندہ رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود چاکر، گواہرام، شے مرید و حانی، حمل جئیند اور بالاچ گورگیج وغیرہ کی بیسیوں نظمیں بلوچوں کو سینہ بسینہ یاد چلی آ رہی ہیں۔ ان ہی نظموں سے متعلق آج سے دو سو سال قبل ایک بلوچ شاعر نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے کہ:۔

اے منی پیڑی ءِ رند نت

اے بلوچی دفتر انت

یعنی: یہ میرے پشتوں کے پاؤں کے نشان ہیں

یہ بلوچی کا دیوان ہے۔

دوسرے لفظوں میں شاعر کی مراد یہ ہے کہ بلوچی شعروں کا دیوان ہی ہماری تاریخ ہے۔

بلوچی شاعری کی پشت پر صدیوں کی ایک ادبی تاریخ ہے جس پر تفصیلی بحث تو کجا اگر اجمالی طور پر بھی کچھ کہا جائے تو کئی جلدیں مرتب ہوں لیکن اس وقت چونکہ ہمارے پیش نظر بلوچی کی صرف رزمیہ شاعری ہے اس لئے اس طویل بحث کو سمیٹ کر ہم صرف ان رزمیہ اشعار کے بیان پر اکتفا کریں گے جو کسی نہ کسی طرح بلوچستان اور بلوچوں کی تاریخ پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اور جو نہ صرف سبق آموز ہیں بلکہ ہماری قومی تحریک کی منازل کو آج بھی نمایاں اور روشن کرتے ہیں۔

دوسرا باب

بلوچی کی رزمیہ شاعری

بلوچی رزمیہ شاعری میں اولیت قبائلی لڑائیوں کے بیان کو حاصل رہی ہے۔ غیر بلوچ قبائل سے بہت کم لڑائیوں کا ذکر ملتا ہے اس لئے قومی لڑائیوں سے متعلق بہت کم رزمیہ نظمیں ملتی ہیں البتہ متاخر دور کے شعرا نے انگریزوں کے ساتھ اپنی لڑائیوں سے متعلق بہت سی رزمیہ نظمیں لکھی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچ اپنی ہمسایہ اقوام کے ساتھ پرامن زندگی گذارتے رہے ہیں۔ اُن پر کسی بھی غرض سے کبھی حملہ آور نہیں ہوئے خال خال جن لڑائیوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ بھی بامر مجبوری اس وقت لڑی گئی ہیں جب ایرانیوں، مغلوں یا افغانوں کی طرف سے بلوچوں کے کسی قبیل پر حملہ ہوا ہے۔ انگریزوں کے ساتھ لڑائیوں کی صورت دوسری ہے۔ ی لڑائیاں آزادئ وطن کے لئے لڑی گئی ہیں، ایک مسلمان کی حیثیت سے اُسے جہاد بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ان لڑائیوں میں بھی بلوچوں نے کبھی جنگ میں پہل نہیں کی ہے ہر موقع پر پہل انگریزوں کی طرف سے ہی ہوئی بلوچوں نے صرف اپنی مدافعت کی ہے۔

انگریز غالباً ۱۸۳۹ء میں بلوچستان کی حدود میں داخل ہونا شر ہوئے تھے، اس وقت سے ۱۹۴۷ء تک تقریباً ایک سو سال بلو قبائل وقتاً فوقتاً ان کے خلاف مدافعانہ لڑائیاں لڑتے رہے جن کا ذک

بلوچی کے ان رزمیہ اشعار میں جن کا ذکر ہم کرنا چاہتے ہیں، تفصیل سے ملتا ہے۔

بلوچستان میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا عرصہ نسبتاً پر امن رہا، گو کہ بلوچوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی جدو جہد آزادی کو ترک نہیں کیا، لیکن ہندوستان میں جنگِ آزادی کی تحریکوں سے متاثر ہو کر اس کے طریقہ کار میں ترمیم کر دی۔ اب مسلح جنگ کی بجائے آئینی جدوجہد کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ انجمنِ اتحاد بلوچستان کے نام سے بلوچستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک سیاسی تنظیم کی بنیاد ڈال دی گئی جو ہندوستان کی تحریک خلافت اور انڈین نیشنل کانگریس سے متاثر تھی۔ اس لحاظ سے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور بلوچوں کی سیاسی تحریک کا ابتدائی دور شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں رزمیہ شاعری کی جگہ قومی شاعری نے لے لی۔ چونکہ اس وقت بلوچی کی قومی شاعری ہمارا موضوع بحث نہیں، اس لئے اس صنفِ سخن کو بالائے طاق رکھکر ہم صرف بلوچی کی رزمیہ شاعری کو زیر بحث لا رہے ہیں جو پندرھویں صدی عیسوی کے وسط سے بیسویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی پر محیط ہے۔

بلوچی کی رزمیہ شاعری جو پانچ صدیاں اپنی آغوش میں لئے ہوئی ہے۔ بلوچستان اور بلوچوں کی قومی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے اسے ہم زبان، طرزِ ادا اور دوسری شاعرانہ خصوصیات کو مدنظر رکھ کر تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں

۱۔ پہلا دور :۔

اسے ہم متقدمین کا دور کہیں گے۔ یہ دور میر چاکر رند اور میر گواہرام لاشاری کے زمانے پندرھویں صدی کے اواخر سے شروع ہوکر پنجاب اور سندھ کی طرف ان کی نقل مکانی سولھویں صدی کے نصف اول پر ختم ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا دور :۔

یہ متوسطین کا دور ہے جو میر چاکر رند اور میر گواہرام لاشاری کی بلوچستان سے نقل مکانی ۱۵۱۰ء کے بعد سے شروع ہوکر بلوچستان کی سرحدات پر انگریزوں کی آمد ۱۸۳۹ء کے زمانے پر ختم ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا دور :۔

متاخرین کا دور ہے جو بلوچستان میں انگریزوں کی آمد ۱۸۳۹ء سے ۱۹۲۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ جسے ہم بلوچستان میں انگریزوں کا دورِ حکومت کہتے ہیں۔

۱۔ پہلا دور (متقدمین)

بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ بلوچی شاعری کی ابتدا ہی میر چاکر رند اور میر گواہرام لاشاری کے زمانے یعنی تقریباً پندرھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ یا یوں کہئے کہ میر چاکر و گواہرام کی باہمی چپقلشوں نے بلوچوں میں شاعری کے جذبات ابھارے اور ان سے ایسی رزمیہ اور عشقیہ نظمیں کہلوائیں جن کی نظیر بلوچی شاعری میں اب تک پیدا نہیں ہوئی، یہ صحیح ہے کہ بلوچی شاعری جسے ہم قدیم یا کلاسیکل شاعری کہتے ہیں۔ تمامتر اس دور کی شاعری ہے جس میں میر چاکر و میر گواہرام اور ان کے دیگر

ہم عنصر بانکوں نے رزم و بزم کی محفلیں سجائیں۔ لیکن زبان کی فصاحت و بلاغت، شاعرانہ ندرت، بے ساختگی اور جوش بیان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس سے صدیوں قبل بھی بلوچی میں شاعری ہوتی رہی ہے، ورنہ یہ ممکن نہیں ہوسکتا کہ کسی زبان کے ابتدائی ایام میں جبکہ وہ ایک طفلِ مکتب کی طرح ابجد کی پٹی میں الجھی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسا فصیح و بلیغ کلام پیش کیا جا سکے جو اس عہد کی بلوچی شاعری پیش کرتی ہے اس وقت اردو زبان ہمارے سامنے ہے، دو سو سال کے طویل عرصے میں جبکہ اسے ابتدا سے ہی عظیم المرتبت حکمرانوں اور با ثروت قدر دانوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اس کے باوجود وہ ہندی، فارسی یا عربی کے پلّے کی زبان نہیں بن سکی ہے۔ اور نہ ہی ان زبانوں کے عظیم شعرا کی ٹکر کا کوئی شاعر پیدا کرسکی ہے علاوہ ازیں ان زبانوں یعنی فارسی عربی وغیرہ کے ابتدائی دور کے شعرا کا کلام بھی موجود ہے۔ جو کسی لحاظ سے بھی اس پایہ کا نہیں جو ان زبانوں کے دورِ عروج کے شعرا کے کلام نے حاصل کیا ہے ہر زبان ابتدائی حالت میں خام، محدود، مشکل، اور کم مایہ ہوتی ہے، رفتہ رفتہ اس میں پختگی آتی ہے۔ وسعت پیدا ہوتی ہے۔ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت ودیعت ہوتی ہے۔ الفاظ کا دامن پھیلتا ہے نئی نئی تشبیہات و استعارات پیدا ہوتے ہیں۔ رمز و کنایہ رواج پاتے ہیں۔ نئے اور موزون الفاظ صورت پذیر ہو کر زبان کو مالامال کرتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ قوم کی طرح زبان بھی ترقی و تربیت کے مختلف ادوار سے گذر کر اپنے لئے رفتہ رفتہ ایک قابلِ قدر مقام پیدا کر لیتی ہے۔

بہر حال اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ پندرھویں صدی عیسوی تک بلوچی ایک ایسی زبان بن چکی تھی جس میں ایک پختہ کار شاعر اپنے جذبات تصور، تخیل اور ادراک و احساسات کو نہایت خوبصورت اور مؤثر الفاظ میں پیش کر سکتا تھا۔ متقدمین کے اس دور سے قبل بلوچی کی کیا حالت تھی ہم کچھ نہیں جانتے کیونکہ پندرھویں صدی عیسوی سے قبل کی زبان کا کوئی نمونہ اب تک ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا ہے اس کے بعد کے ادوار میں بلوچی پر کیا بیتی، اس کا بیان ہم آگے چل کر کریں گے۔

۱۔ افتتاحیہ اشعار

متقدمین کے دور میں بلوچی سادہ اور سلیس تھی۔ شاعر کا کلام سُن کر ایسا لگتا تھا جیسا کہ اس کی زبان سے بے ساختہ الفاظ کا چشمہ پھوٹ رہا ہو۔ یا جیسا کہ پردہ سیمیں پر کوئی چلتی پھرتی اور بولتی تصویر دیکھی جا رہی ہو۔ بیبگر رند کی مشہور نظم کے یہ افتتاحیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ کہتا ہے ؎

قندہار باگھے یا مرا گاہے
بادشاہانی ہند و جاگاہے
جلگھی سئیں ءُ رتیگان رائے۔
تاکچرءُ پیداک ئت اُمل ماہے
ننگی ڈیلوں کشتہگ آہے۔

یعنی:۔

قندہار ایک ایسا باغ ہے۔
جہاں محفلیں جمتی ہیں۔
اور جہاں بادشاہ رہتے ہیں۔

ایک دفعہ سیر کرتا ہوا
میں ایک راستے سے گذرا۔

دریچے میں
ایک انمول ماہ پیکر نظر آئی

میرا قدِ بالا کانپ اٹھا۔
اور میرے دل سے ایک آہ سرد نکلی۔

اسی طرح رزمیہ اشعار میں بھی متقدمین کی زبان سادہ، مؤثر اور خنجر بُراں کی طرح تیز تھی۔ میر گواہرام لاشاری اپنی ایک رزمیہ نظم میں میر چاکر رند کو شکست دینے کے بعد فخریہ انداز میں کہتا ہے ؎

پوئے ہوئیکہ سوب منی بیتہ
ما جتہ چاپولے بریان ءَ !
ریگنت گوری بور کنٹر پادین
ہردپارے مں محشرین سیبی
چاکر پہ زند ائیں گھٹے زریت !
چاکر چہ جھولیں کنڈگاں برزبیت
سایاں مں درنشکانی بزیں کوشتیت
منتگیں گرکی اش پدا گندیت

یعنی:۔
ہیا ہیا کہ جیت ہماری ہوئی
ہم نے دشمن کو ایک ایسا چانٹا مارا
کہ وہ اپنی گھوڑیوں کو

ہرنوں کیطرح دوڑاتے ہوئے بھاگ گئے۔
جاکراب بستی میں
جہاں اس شکست سے حشر برپا ہوچکا ہے۔
ہرلمحہ،
زندانِ غم میں تڑپ تڑپ کر اٹھائے گا۔
جاکر گھاٹیوں پر چڑھ کر بھاگا
اور پھر تھکاوٹ سے چور بھیڑیے کی طرح
درختوں کے گھنے سایوں میں ٹھہر کر
(اپنے تعاقب کرنے والوں کو)
مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔

یہ اور اس قسم کی بیسیوں مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دورِ متقدمین کے شعرا اپنی رزمیہ نظموں کی ابتدا حمدِ باری تعالیٰ۔ نعتِ رسول، مدح چار یار اور تذکرۂ پیر وار لیا، سے (جیساکہ بعد میں رواج پڑگیا) نہیں کیا کرتے تھے بلکہ عموماً وہ فخریہ اشعار سے اپنی نظم کی ابتدا کرتے یا پھر کسی شخص یا شے سے مخاطب ہوکر نظم کہتے، جیساکہ ریحان رند گھوڑ دوڑ وال اپنی مشہور نظم میں کہتا ہے ؎

اومنی بیل! اوگگرؤ لوھار
گڑ منی شول ءُ شش تلیں نالان
بیارمنی ءُ گوں تیگھ سریں میحان
بیارش تاں استادی منش نبدان
چ مہک پڑؤ نز تیرؤ گواہ نبت

بُرزءَ چہ سُمّ ءُ گھٹیں بُرجان
جہُل ءَ چہ شیشا ران پچو کیناں.

نی ار اے میرے ساتھی :
اے گگرؔ کے (نعل بند) لوہار
میرے جنگی گھوڑے کے لیئے
چھ چھیدوں والے نعل گھڑلے.
اور پھر اُن کو
نوک دار اور تلوار کی طرح تیز کیلوں کے ساتھ
میرے پاس لے آ.
تاکہ میں استادی سے اُنہیں
اُس کے گول سُموں کے اُبھار کے اُوپر
اور شیشم جیسے پاؤں کے نیچے
اس طرح سے باندھ لوں کہ
پتہ مگس سے بھی باریک تر نظر آئیں.
ی طرح میر چاکر رند لڑائی پر روانہ ہونے سے قبل اپنی گھوڑی سے
ب ہو کر کہتا ہے ؎
او کُمیت نوش کن تیرگ ءُ داناں
بزکن وتی پیلی گردن ورانان
درکدیمان دا ترءَ جم کن !
اش مڑاں کو ہیں تیھرے شم کن

جگ نہ وش انت کہ بتگے بندان
روان ہماڈیھہ دَ کہ پلے گندان

یعنی:- اے میری کمیت گھوڑی
اپنے توبرہ کے دانے کھا۔
اور اپنی ہاتھی جیسی گردن اور رانوں کو موٹا کر
اپنا دانہ کھا اور تسلی رکھ۔
دشمنوں سے اپنی تیوری پر بل نہ آنے دے۔
لوگوں کو یہ بات پسند نہیں:
کہ تو اصطبل میں بندھی رہے
ہم جلد اس علاقے کے ایک بہادر کو
دیکھنے جائیں گے۔

میر گواہرام لاشاری کا خطاب اپنے قبیلہ کے معزز افراد سے ہے
اپنی ایک مشہور رزمیہ نظم کی ابتداء اس طرح کرتا ہے:-

او منی شاہی ہمدلیں براتان
بیائت اوراجانی رگہیں مردان
لس لاشار ءِ خان و سرداران
بیائت کہ دیوانے کنون براتی

یعنی:- اے مجھ سے اتفاق کرنے والے
میرے شاہ صفت بھائیو!
اے قبائل کے معزز لوگو!

اور اے تمام لاشاری قبیلہ کے

خانو! اور سرداروا

آؤ کہ آج ایک برادرانہ اجلاس کریں۔

بابر سہراب کا انداز بیان کچھ مختلف ہے اُس کا ابتدائی خطاب اپنی

ات سے ہے، کہتا ہے:۔

ریشِ واسر، کہ چیئے گون داتہ

آمزن ٹپیں تیگھی مان آئنت ؟

تیرش من آلائیں کش ءَ گواہ بنت

گونڈلان ماری کھنڈ کنت جان ءَ

نما:۔ آج میرے کان بج رہے ہیں

کیا چیز میرے سر سے ٹکرائی ہے۔

کیا، اُسے وہ چوڑے زخم لگانے والی

تلواریں یاد آ رہی ہیں۔

یا پہلوؤں میں کھبنے والے وہ تیر یاد آتے ہیں۔

جن کی خدنگیں

سانپ کی طرح جسم کو کاٹتی ہیں۔

جونگو غلامو اپنی رزمیہ نظم کی ابتدا بادلوں سے خطاب کرکے کرتا ہے:۔

جی زر ءِ مہور بستگیں نودان

کنوشش پہ تیلانکاں برنت برزءَ

گون دیاں، جونیاں رساتاں

یعنی

اے سمندر سے اُٹھ کر
جال کی طرح آسمان پر پھیلنے والے بادلو!
جنہیں سمندری ہوائیں
دھکیل دھکیل کر اوپر لے جاتی ہیں۔
میرے اشعار سُن لو!
میں اپنے خونی دشمنوں کو
پیغام بھیج رہا ہوں۔

میرو مندوست کا اظہارِ بیان فخریہ ہے۔ کہتا ہے:۔

تیگھ و ارجل ءَ نپتین ءَ
مندوستے ءِ ارڑءَ سبزین ءَ
دتی جنڈ ناں زرین ءَ
زر تریزین رہ ءَ آہن دت
مُجلهت ءَ بندی پہ گھنی ءَ
گوءَ گون وہ ءَ پھر زیت

یعنی! تیغ اور بجلی کی طرح کوندنے والی
مندوست کی سبز تلوار کی کیا بات ہے
وہ جسم پر بہت گہرے زخم لگاتی ہے۔
آج، وہ پھر اس کی مقناطیسی دھار کو
نیلے تھوتھے سے رنگ دے رہا ہے۔
لڑائی پر جانے کے لیے

یعنی:

اے سمندر سے اُٹھ کر
جال کی طرح آسمان پر پھیلنے والے بادلو!
جنہیں سمندری ہوائیں
دھکیل دھکیل کر اوپر لے جاتی ہیں۔
میرے اشعار سُن لو!
میں اپنے خونی دشمنوں کو
پیغام بھیج رہا ہوں۔

میر و مندوست کا اظہارِ بیان فخریہ ہے۔ کہتا ہے:-

تیگھ و ارجلءَ نیمتیںءَ
مندوستءَ لڑءَ سبزیںءَ
دتی کھڈ ناں زریں ءَ
زر زیریں رہءَ آسن وتت
مجلعتءَ بندی پہ گھنیءَ
گوءَ گون وہءَ پہر زیت

یعنی:-

تیغ اور بجلی کی طرح کوندنے والی
مندوست کی سبز تلوار کی کیا بات ہے
وہ جسم پر بہت گہرے زخم لگاتی ہے۔
آج، وہ پھر اس کی مقناطیسی دھار کو
نیلے تھوتھے سے زنگ دے رہا ہے۔
لڑائی پر جانے کے لیے

وہ اسے میان میں ڈال دیتا ہے
اور اس کی دھار کی حفاظت کرتا ہے

بلوچ شعرا میں بالاچ گورگیج وہ واحد شخص ہے جس کی نظموں سے بلوچ قومیت پھوٹ پڑتی ہے۔ وہ اپنی رزمیہ نظموں کی ابتدا بھی بلوچ قومیت پر فخر کے جذبات سے کرتا ہے، کہتا ہے:

کوہ ئنت بلوچانی کلات
امبارش بے راھیں گرئنت
برزیں ھشی اش سائیگنت
آپش ہوکین چمگنت!
کوڈی اش پیش ءِ کنڈلنت
نشتیں جھش کھر گا ڈ گنت
بوپ ءِ بدل سبزیں سکنت
سنگنش تلشیں سر جد ئنت
بورش سپیتیں چجو ئنت
بچش گپنیں گونڈلنت!
براتش تلاریں اسپرنت
براز ھگش شلیں خنجرنت
ھاریفش سیواتی جگنت!
زاماتش مدداریں ڈرنت

یعنی: پہاڑ بلوچوں کے قلعے ہیں۔

دشوار گزار اور بیراہ گھاٹیاں اُن کے گودام ہیں،
وہ اونچی چٹانوں کے سایے میں بیٹھتے ہیں
اور بہتے چشموں کا پانی پیتے ہیں۔
پیشؔ کے پتوں سے اپنے آب خورے بناتے ہیں
خار دار جھاڑیوں میں بیٹھتے ہیں۔
پہاڑی ندیوں کی باریک کنکریاں
ان کے لئے گدیلوں کا بدل ہیں۔
اور صاف پتھر ان کے سرہانے ہیں۔
(کچے چمڑے کی) سفید چپلیاں اُن کے گھوڑے ہیں
اچھے خدنگ اُن کے بیٹے ہیں۔
چکنی اور سخت ڈھالیں ان کے بھائی ہیں۔
نوکدار خنجر اُن کے بھتیجے ہیں۔
سیوائی کمانیں ان کے باپ ہیں۔
اور جوانمردوں کو کاٹنے والی تلواریں ان کے داماد ہیں۔

۲۔ اسلحِ جنگ:۔ متقدمین کے دور میں بلوچ میدان جنگ میں جس طرح بن ٹھن کر نکلتے تھے اور جو ہتھیار استعمال کرتے تھے، شعراء نے اپنی رزمیہ نظموں میں ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً براہوئی جدگال جنگ میں میر بجار میروانی کے لشکر نے جس قسم کے ہتھیار استعمال کئے تھے شاعر ان کی نشاندہی کر کے کہتا ہے:۔

ؔ کھجور کے درخت جیسی ایک جھاڑی کے پتے

درادل ٹوتھو گوں تلیں مَل ءَ
گوں ہمابور دگوں ہما بَل ءَ
گوں کمان ءَ وخنجر دزَل ءَ
دوری گُرتہ چو گژنگیں گرک ءَ
مانی شانتگ چو کابلی ترک ءَ
گزیں پہ تیگھ دگوشوگوں سنگ ءَ
نعرہ نرشیری ئیں جتہ دِنگ ءَ

سب سے پہلے ٹوتھو پہنچا
اپنے موٹے بور گھوڑے پر سوار
نیزہ سنبھالے ہوئے
کمان، خنجر اور تلوار سے وہ لڑتا رہا۔
بھوکے بھیڑیے کی مانند
وہ لڑائی میں کود پڑا۔
اور کابل کے ترکوں کی طرح
وہ دشمنوں کو کاٹتا اور پھینکتا رہا۔
گزین، تلوار سے لڑتا رہا۔
اور گوشو پتھر سے
شیرِ نر کی مانند
یہ قوی ہیکل شخص گرجتا اور لڑتا رہا۔

جس وقت رند اور لاشار قبائل مکران سے نقل مکانی کر کے نکلے،

اُن کے پاس جو ہتھیار تھے شاعر نے ان کا ذکر کیا ہے اس نظم کا شمار بلوچی کی قدیم ترین نظموں میں ہوتا ہے، شاعر کہتا ہے کہ جب رند و لاشار کمران سے نکلے تو :-

ھُل پوشں گوں دسکلاں
دراہ کمان و جابہ انت
پاک پیچاں گوں قبا ہان !
پادان لالیں موزہ انت
کارچ و کٹار نقرہ مُیان !
دستاں مندری تنگہ انت

یعنی :- زرہ بکتر اور دسکلائی پہنے
سب کمان اور ترکش سے مسلح تھے۔
پیچ در پیچ پگڑیاں باندھے،
قبائیں اوڑھے،
پاؤں میں سرخ موزے پہنے ہوئے تھے۔
چاندی کے قبضہ والے چھرے اور کٹار سجائے۔
انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں پڑی تھیں۔

میر گواہرام لاشاری اپنے حریف رندوں کے ہتھیاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

رند پھچگی تہ ان، مئے بُنءَ
تیگھ و کپوچی توپک ان
بلنت و شیرازی رُژن ،

یعنی: رندوں کو ہم نہیں پہنچ سکتے

ان کے پاس تیغ اور تڑ بھاو جند رتیں ہیں

نیزے اور شیرازی تلواریں ہیں۔

اپنی ایک اور نظم میں ہتھیاروں کا ذکر کرتے ہوئے میر گوہرام اشاری کہتا ہے:۔

روچ ءَ کہ چست بُرتہ

رند دیان تریل بیتگنت

مان اَنگنت سانڈی جگان

جان ءِ شیرازی زہان

کردان ءِ گیسنڈی اسپران

یعنی: جب سورج کسی قدر بلند ہوا

رند اپنی گھوڑیوں پر سوار جھپٹ پڑے۔

مضبوط کمانیں کڑکنے لگیں

نیزے اور شیرازی تلواریں

سینوں اور گینڈے کی ڈھالوں پر پڑنے لگیں۔

بلوچ لڑا کے جس شان سے بن ٹھن کر اور ہتھیار سجا کر میدان جنگ میں نکلتے ہیں ایک اور نظم میں اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

بور موکاں چہ مشھی سایاں بونگنت

پشت ولانکیگ دزین بداں بداں لبتگنت

نوکری جدی شانگ و تیمار کنگنت

مں دتی راستیں پنجگ ءُ کشیری سگھار
نیزگش اڑ داتہ کہ یانی پائدانواں

یعنی :

بہادروں نے اپنی گھوڑیاں
چھپروں کے سائے تلے سے کھول دیں
گھوڑیاں جو ہمیشہ زیرِ پرورش رہتی ہیں۔
نوکروں نے برش اور کنگھے سے
اُن کو سنوارا اور سنگھارا
اُن کی پیٹھوں پر زین
مالکوں نے خود کس دی۔
اور پھر دائیں ہاتھ میں کشیری تلواریں لئے
نیزوں کو
ایڑیوں پر پائدانوں میں ٹکا دیا۔

تبرزِب یا چھوٹی کلہاڑی بلوچوں کا ایک عام ہتھیار رہی ہے۔ لیکن رزمیہ نظموں میں اس کے میدان جنگ میں استعمال کا بہت کم ذکر ملتا ہے بالاچ، گورگیج نے صرف ایک دفعہ دشمن کے خلاف کلہاڑی سے کام لینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، کہتا ہے :۔

دستوں برآ شلیں خنجرءُ بُرتاں
کارتہ انت شلیں خنجر و ہوت ءَ
دستوں برت پولائیں تبرزین ءَ
کارتہ انت پولائیں تبرزین ءِ

یعنی :- میں نے نوکدار خنجر پر ہاتھ ڈالا
نہیں ! نوکدار خنجر اس بہادر پر کارگر نہیں ہوگا۔
پھر میں نے
فولادی کلہاڑی پر ہاتھ ڈالا
نہیں ! فولادی کلہاڑی کا بھی یہاں کام نہیں۔

البتہ حمل جیئند کلمتی نے پرتگیزی بحری قزاقوں کے خلاف لڑائی میں کلہاڑی استعمال کی ہے جو دوران جنگ کشتی کے سکان میں پھنس کر ٹوٹ گئی۔ حمل کہتا ہے :-

زیادہ ٹیین تا وانے من ءُ سکان داتگت
منی تبرزین چہ نقرہ ٹین بیحان ورشتگ
من زرءِ گُبءَ کپتگ وہپت پشتی شتگ

یعنی :- زیادہ نقصان مجھے سکان نے پہنچایا
میری کلہاڑی اس میں پھنس گئی
اور اپنی چاندی کی کیلوں سے نکل گئی
بحر زخار میں جا گری۔
اور مجھ سے سات پشتوں تک کیلئے بچھڑ گئی

۳۔ زبان و بیان :-

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ متقدمین کی زبان ٹھیٹھ، سہل اور رواں تھی۔ عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ جو متوسط اور متاخر دور کے شعرا کی زبان میں راہ پا چکے تھے۔ متقدمین کے اشعار میں نہیں ملتے، البتہ

کوشانی، ہندی اور سنسکرت کے بعض الفاظ جیسے گَل۔ رانا، پورب، پچھم اُتر، دکن، ہتھیار، رَن، گبرو، دھرتی، جگت، مہرارو، جی یل، جی دار ہجوم، دھڑ، گھوڑو، بول، ساون، اندھرا، اندھیرا اور ڈاتار وغیرہ بیسیوں ایسے ملتے ہیں جنہیں غالباً بلوچی ہی خیال کیا جاتا رہا ہے۔ ذیل کی چند مثالوں سے اس کی بخوبی وضاحت ہو سکے گی۔

۱۔ گَل :۔ کوشانی زبان کا لفظ ہے، صیغہ جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ :۔ کتہ سردار گل ءَ مُچّی

سری شردار یاں بچّی

بشارں گاجرو مُچّی

یعنی :۔ سردار سب جمع ہوئے،

تاکہ تکلیف سے اُن کی جان بچ جائے۔

انہیں گاجر وپھل کھانے کو بہت ملتی تھی۔

چکاں ٹوہ کنہت جوگی ءَ

گوں اندوہاں لا پیک ءَ

بیگاہ چکّ گل ءُ تاڑیت

یعنی :۔ بچّو! اس جوگی کو بھگادو

یہ پیٹ کا مارا۔

رات بچوں کو تاڑ دے گا۔

۲۔ رانا :۔ کوشانی لفظ ہے ہندی میں بھی مستعمل ہے بادشاہ یا راجا کے لئے میں بولا جاتا ہے۔

جود میتا پاں بھکوّں بارکنوں دی پہ کوتان
راج ءِ رانا کس ملیکھوں بیاتکاں داں لوگ ءِ گدان

یعنی:- ندیوں اور سیاہ آب سے سیراب زمینوں کو
فتح کرکے آپس میں تقسیم کرلیں۔
دوسری قوموں کے بادشاہوں (راجاؤں) کو خاطر میں نہ لائیں
یہ فیصلہ کرنے کے بعد
وہ (بلوچ) اپنے گھروں اور خیموں کی طرف آئے۔

۳- اتر، دکن، پچھم :- ہندی کے الفاظ ہیں

اُتّری دیرہ نیدیں گروک بیاتنت
دکّن ءِ سارتیں کتوشی ماناتنت

یعنی:- دُور شمال کی کڑکتی بجلیاں آئیں۔
اور جنوب کی ٹھنڈی ہواؤں سے ٹکرائیں۔

دھان مں تیرگ ءَ لالین ءَ
آپ من پچھی کوڈیان !

یعنی:- (میری محبوبہ)
سرخ توبرے میں تجھے دانہ کھلاتی
اور لکڑی کے مغربی پیالوں میں تجھے پانی پلاتی تھی۔

۴- ہتھیار:- ہندی لفظ ہے۔

ہتھیار گپتگنت سرداری ء
شاہی یک رہیں دوستدار ء

یعنی:- انہوں نے سردار کے ہتھیار لے لیئے۔
جو بادشاہ کا دوست اور طرفدار تھا

۵:- رن:- جنگ لڑائی ہندی لفظ ہے۔

تو ہشیارے س ڈمبگ ء زرتے۔
ننگریں پیروز ء رن ء روچ ء

یعنی:- تم پر ندامت کی دم لگ گئی۔
غیرت مند فیروز کی لڑائی کے دن

۶۔ گبرو:- نوجوان، دلیر، ہندی کا لفظ ہے۔

گبرو، تقدیراں ترا آرتہ
ترک تئی گہگیریں سرءَ برنت
پس کلات ء دروازگ ءَ بدجنت

یعنی:- اے بہادر نوجوان! تقدیر تجھے لے آئی ہے۔
ترک تیرے اس بانکے سر کو کاٹ کر
قلعے کے دروازے پر لٹکا دیں گے

بیگھا ے کتہ ستوزین ہنجر ء
بیا اد گبرو! چوں بیتہ ترا

یعنی:- ساتولی لڑکی نے پیغام کیا

اے بہادر نوجوان ! آجا
تجھے کیا ہو گیا ہے

۷۔ دھرتی :۔ زمین ، ہندی لفظ ہے۔

اُرد ہمایون ءَ باز دبے گانجنت
دھرتیءَ سایا شدّھوبی تکّنت

یعنی :۔

ہمایون کی سپاہ بہت اور بے حساب ہے
اُن کے نوکدار نیزوں سے
زمین پر سایا ہوتا ہے۔

۸۔ جگ :۔ دنیا ، جہان ہندی زبان کا لفظ ہے۔

جگ سہبگنت کہ حمزہ ءِ ذات انت
جگءَ پہ دشیں قصّہے شات انت

یعنی :۔ دنیا کو معلوم ہے کہ وہ ، (بلوچ) حمزہؓ کی ذات سے ہیں
دنیا ان کو اچھے نام سے یاد کرتی ہے۔

۹۔ مہرارُو :۔ کنیز ، خوبصورت عورت۔ ہندی ہے۔

گوشتہ بہرارو گوھرءَ
وت گوں امیریں چاکرءَ

یعنی :۔

اُس حسین عورت گوہر نے
خود میر چاکر سے کہا

۱۰۔ جی دار، جی یل :۔ دلیر، بہادر، ہندی لفظ ہے۔

جی یلیں چارِیے بشیکارتیں۔
چوشی من دیوان ءَ حوال داتیں
چارتاں سرحدءِ مزار بورین

یعنی ایک بہادر جاسوس کو اُس نے اشارہ کیا۔
جس نے واپس آکر مجلس کو اطلاع دی
کہ وہ سرحد کا خاکی رنگ کا ببر شیر دیکھ آیا ہے۔

۱۱۔ ہجوم :۔ انبوہ، اژدہام، لشکر۔ عربی کا لفظ ہے مگر اردو میں مستعمل ہے۔

اے مردِ چاکر شیہکِ اِنت
قول و دھدھی یک ڈکِنت
تُرکانی ہجوُمیت سکِنت

یعنی ا۔ یہ شخص شیہک کا بیٹا چاکر ہے۔
جو وعدہ و قول کا پکا ہے۔
ترکوں کا انبوہ تیرے خلاف امنڈ رہا ہے۔

۱۲۔ دھڑ :۔ جسم ، بدن ۔ ہندی کا لفظ ہے۔

پوشِتہ رندان وتی دھتڑ
گون قبا و شُدھواں

یعنی:۔ رندوں نے اپنے بدن پر
قبا اور ریشمی لباس پہن لیے۔

۱۳۔ **گھوڑو:**۔ گھوڑ سواروں کا دستہ، رسالہ

سیوی گھوڑوی گرداں بات
شوہیں گوہرءِ ے ردچان!

یعنی سبی، سواروں کے گھوڑوں کے پاؤں کے نیچے سے
اٹھے ہوئے گرد وغبار میں غرق ہو جائے۔
بدبخت گوہر کے لیے ماتم کیا کرے۔

۱۴۔ **بول:**۔ لفظ، بات، پیمان۔ ہندی کا لفظ ہے۔

چاری کشتگنت چہرانی
بولش بستگنت پہرانی

یعنی:۔ انہوں نے دیکھ بھال کرنے والے (سکاوٹ) متعین کر دیئے،
اور پہرہ داروں کے لیے الفاظِ شناخت بھی مقرر کر دیئے۔

۱۵۔ **آندھرا، اندھیرا:**۔ تاریک ہندی ہے۔

زنّوں ءِ قہاریں پشوجان
آسمان آندھرا بیت مشوجان

یعنی:- ذوالنون کی افواج قاہرہ
جن کی امواج گرد سے آسمان پر اندھیرا چھا جاتا

۱۶:- ڈاتار:- ہندی کے لفظ داتا سے نکلا ہے، دینے والا، سخی
پیری ئے لولیاں مدے زیج ئو
بگوا ئرگجن وڈاتار وسخی بانغئے
یعنی:- بیٹے کو بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کی دعائیں نہ دے
بلکہ کہدے کہ تلوارباز، فیاض اور سخی ہو،

بلوچی سے متعلق مسٹر لانگورتھ ڈیمز اپنی کتاب "بلوچ نسل" میں
جگہ لکھتا ہے کہ:-
"بلوچی جیساکہ مشہور ہے ایک ایرانی بولی اور جدید فارسی
زیادہ قریب ہے مگر ساتھ ہی کئی نکات میں قدیم فارسی کے
ژندیا قدیم باختری زبان سے ملتی ہے۔ اپنی فرہنگ میں اگر ایک
فارسی جدید سے تو دوسری طرف سندھی اور جٹکی (سرائیکی) جیسی
بولیوں سے الفاظ کی ایک بہت بڑی مقدار بھی مستعار لے چکی ہے
نے بلوچی کو کم الفاظ دیئے ہیں لیکن خود اس سے بہت زیادہ لے
عربی اثرات بلوچی پر بہت زیادہ نہیں۔ عام طور پہ یہ ان مجرد مذ
و محاورات پر مشتمل ہیں۔ جو تمام اسلامی ممالک میں عام اور مشترک
بھی جدید فارسی کے ذریعے سے رواج پذیر ہوئے ہیں اگر بلوچی
عنصر زیادہ اہم اور اثرانگیز ہوتا تو حکومت قبائلی تنظیم، جنگ، ا

گھوڑوں سے متعلق جن سے ایک خانہ بدوش نسل کا حکمران طبقہ خصوصیت
ساتھ واسطہ رکھتا ہے زیادہ الفاظ عربی ہی سے لئے جاتے، جیسے کہ
ری میں ایسے الفاظ نارمن اور فرانسیسی سے لئے گئے ہیں، لیکن بلوچی میں
سے اس سلسلے کا ایک لفظ بھی عربی سے لیا گیا ہو۔ گو کہ سندھی کے الفاظ
قدر ملا دیئے گئے ہیں۔ مگر اس سلسلے کے تمام تر الفاظ یا تو قدیم
عنصر سے لئے گئے ہیں اور یا پھر چند ایک ترکی سے"!

زبان کی سلاست، روانی اور اظہار مطلب میں تسلسل اور ہم
گی، ندرت بیان اور شوکت لفظی متقدمین کا خاصہ تھا، معدودے چند
ار میں میدان جنگ کا ایک ایسا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے کہ سننے والا عش عش
اٹھتا تھا، مثلاً:۔

ایک دفعہ جب رند لاشاریوں کے اونٹوں کا ایک گلہ لوٹ کر لے جا رہے
گہرام لاشاری نے اپنے چیدہ گھوڑا سواروں کے ساتھ انہیں جا لیا، اس
کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

کیذان کنگ بازان مسیت
پیدا بنگیت گوا ہرام زیت
ز بنگ بہ گور ئے دمنز دھیت
اتکنت درزبان لاشاری
بان اتکنت گوئر د کاٹاری
ہپت صد کنگران گا ڑینتنت
بگت ءَ پر بدا تر ینلنت!

نی:۔

اقلیت نے اکثریت پر فتح پائی۔
گو ابرام بہت جلد آپہنچا۔
گرد و غبار کا دھواں ہر طرف سے اٹھنے لگا۔
آن کی آن میں لاشاریوں نے انہیں آلیا۔
وہ اس طرح آپس میں گتھ گئے۔
جیسے خنجر سینے میں اتر جاتا ہے۔
سات سو بانکے کاٹ پھینکنے کے بعد
لاشاری اپنے اونٹوں کا گلہ چھین کر واپس لے گئے۔

ایک دفعہ میر چاکر رند اپنے لشکر کو لاشاریوں سے لڑنے کے لئے میدانِ جنگ کی طرف لیجا رہا ہے اس وقت میر چاکر پر جو کیفیت طاری ہے شاعر اُسے مختصر الفاظ میں اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ میر چاکر کی تصویر نظروں میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ کہتا ہے:۔

چاکر مں سرءَ جُنبان ئَنت
شان ءِ شادھی زُنبان ئَنت
چو مستیں لیڑو ءَ دریاپ ئَنت
وُرنایاں پدا گُندان ئَنت

یعنی:۔ چاکر (لشکر کے) آگے آگے۔
(جوش و پیکار سے) جھومتا چلا جا رہا تھا۔
ایک شان مسرت و شادمانی سے
آگے بڑھ رہا تھا۔

براتانی کشک تادان انت
دنیا گردِش د گردانی !
ترا پادار نہ بیت اے فانی
تا نیکن زندگئے ارمانی !

یعنی

چاکر! دیوانہ کیوں ہو رہے ہو۔
بھائیوں کو سمندر میں کیوں دھکیل رہے ہو
سردار! تلوار کو میان میں ڈال دو۔
اُن اونچی گھاٹیوں کو نظر میں رکھو،
(جن پر تم کو گذرنا ہوگا)
ڈوھانی ایک ہزار بہادر میدان میں لے آئیں گے
بغیر اُن شمشیر باز لاشاریوں کے
جو ایک ساتھ کمر لبتہ ہوکر
تمھارے مقابلے میں صف آرا ہونگے۔
تب آگے بڑھنا،
تم کو ایک خونین جنگ میں پھنسا دے گا
اور پیچھے ہٹنا
اُن کے لئے عیب کی بات ہوگی۔
تم اگر ان کو شکست دے کر بھی، آگے بڑھو گے
تب بھی نقصان میں رہو گے۔
کیونکہ بھائیوں کو مار ڈالنے میں

آپ د تیهی مان آیوں
ہو شنگ پنج کنون اِپتی ءُ
تہ نند و گند کنی سیت دبیت
ملاّ پہ کے ءَ دی وانیت
سیت ءُ گون کے ءَ دی کاشیت

یعنی :۔

بی بکر! تجھے خدنگوں نے سہما دیا ہے۔
ہندی تلواروں نے تجھے چکرا دیا ہے۔
تیروں اور ٹیڑھی دھاروں والے خنجروں نے
تجھ پر میعادی بخار طاری کر دیا ہے۔
تم اس لڑائی میں رندوں کا ساتھ اس لئے نہیں دینا چاہتے
ہوم نوحانی تیرا رشتہ دار ہے۔
(تم مت ڈرو)
میدانِ جنگ میں جب ہم شمشیر زنی کے جوہر دکھلائے جائیں گے
تو تجھے تیروں کی پہنچ سے دور بٹھا دیں گے۔
اور تجھ پر ایک کمبل ڈال دیں گے
اگر غلطی سے کوئی تیر تیری طرف آئے
اُسے ہم اپنی طرف پھیر یں گے۔
ہم اور شمشیر زن لاشاری۔
اس طرح آپس میں ٹکرائیں گے۔
جیسا (سیلاب کا) پانی بند سے ٹکراتا ہے۔
(جواری کے) خوشوں کی طرح

ہم ایک دوسرے کے سر کاٹتے رہیں گے۔
تم دُور بیٹھ کر تماشا دیکھو گے
مُلّا کس فریق کے لئے فاتحہ پڑھتے ہیں
اور فتح کرکے کون واپس پلٹتا ہے۔

بلوچی کی رزمیہ شاعری میں میر چاکر رند اور میر گواہرام لاشاری کی لیفانہ نوک جھونک کو ایک خاص مقام حاصل ہے اس صنفِ سخن میں طعن و تشنیع کے جو تیر و خنجر چلائے گئے ہیں۔ جو مؤثر، شستہ اور سلیس مگر پُرجوش ن ستعمال کی گئی ہے اور جن برمحل، موزون اور شائستہ تشبیہہ و استعارو ت ہ م یا گیا ہے، بلوچی رزمیہ شاعری میں اُن کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ اس سلسلے کی ایک نظم میں میر چاکر رند اپنے حریف میر گواہرام لاشاری کو لکار کر کہتا ہے:-

مرد بی، کہ مرداں ژگِپتگے
رنداں گوں سیالی جیڑدان

نی:-

اب مرد بنو کہ
تم نے مردوں کو للکارا ہے۔
تم نے رندوں کے ساتھ
برابری کا دعویٰ کیا ہے۔

ایک اور طویل نظم میں میر گواہرام سے مخاطب ہو کر میر چاکر کہتا ہے:

روچے من گرائیں بیہن و جنگے،
اَش پدا رندی گونڈلان واتے

من ئگر نڈان وبز ترین جا ہان !
رُنبے اُش وا بانی کلات زرتے
گینی من میلائی دَپ دَکشتے

یعنی :-

(میر گواہرام ! وہ دن یاد کرو)
جبکہ گھمسان کا رن پڑا تھا۔
تم ، رِندوں کی خدنگیں۔
اپنے چوتڑوں اور پٹھوں پر کھاتے ہوئے
بھاگ نکلے
دابانی کلات سے جو تم بھاگے۔
تو درہ مولہ کے دہانے پر پہنچ کر دم لیا۔

اسی نظم میں آگے چل کر میر چاکر فخریہ انداز میں کہتا ہے:۔

اُش منی چاپول ءَ مزاری ٹین
تو ءِ مچلّے من گوش بُن ءَ دارتے
سر تر ہان بیتے چو کُرگین مادھیان
سر تہتر ءِ مس عالم ءِ کنڈان

یعنی :-

میرے ببر شیر جیسے پنجے کی
ایک چپت کنپٹی پر کھا کر
تم گھوڑی کی بچھیری کی طرح بدک کر
یوں بھاگے کہ اب تک اطرافِ عالم میں
سرگردان بھٹکتے پھر رہے ہو۔

اس نظم میں جہاں میر چاکر اپنی قوت پر فخر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

وہاں وہ اپنے قبیلہ یعنی رِندوں کو بھی فراموش نہیں کرتا۔ میر چاکر اپنا فخریہ انداز بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے :۔

ما ہما رِند و بارگین بوروں
گاہے بر زین و گاہ دری زیوں
گاہے گوں تاوان ءِ شریک داروں
گاہے گوں سیت ءِ سری کایوں

یعنی :۔ ہم وہی پتلی گھوڑیوں والے رِند ہیں
جو کبھی زین پر ہوتے ہیں
(شکست کھا کر)
کبھی ہم نقصان اٹھاتے ہیں۔
اور کبھی تین گنا فائدہ اٹھا کر لوٹتے ہیں

اور پھر اسی نظم میں میر گواہرام پر طنز کرتے ہوئے میر چاکر کہتا ہے :

گواہرام !
تو کہ شیر بارانی لگھورانے
من سمرءَ سیاہیں لشکران ڈھوسے
نیں ہومرءِ پہنا دیں گوَرءَ ڈکئے

یعنی :۔ اے میر گواہرام !
تم شیر قالین اور بزدل ہو۔
اور اب میر ہومر کی پناہ میں
تم اپنا سر،

جس پر تاڑے ننگے دھونے سے تم کو عار نہیں آتی

چھپا رہے ہو

میر گواہرام لاشاری بھی میر چاکر رند سے دبنے والا بلوچ نہ تھا
سالہ خانہ جنگی کے دوران میں میر چاکر کو کئی بار اس کے ہاتھوں شکست
پڑی۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ میر چاکر نے ہرات جا کر شاہ حسین
سے امداد کی درخواست کی۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا

چاکر گون دِل ءَ جیڑان ءَ
میرہان ءِ گھماں لیڑان ءَ
رپتگ باگھیں قندہار ءَ
فریادی بما دربار ءَ
چوداں من ہرلوی شہر ءَ
سلطان شاہ حسین ءِ بہر ءَ
گون ترکاں نشتگت باہوٹی
گیرائین لشکران ءَ لوٹی!

یعنی :-

چاکر اپنے دِل سے جھگڑتا ہوا۔
میر خان کے غم میں پیچ و تاب کھاتا ہوا
باغوں والے قندہار کو گیا۔
شاہی دربار میں فریاد لے کر،
اور پھر وہاں سے ہرات کو گیا۔
سلطان شاہ حسین بیکرہ کی طرف۔

ترکوں کی پناہ میں جا بیٹھا
اُن سے ایک بڑا لشکر مانگا۔

کہتے ہیں کہ میر چاکر کو شاہ حسین سے جلد امداد نہ مل سکی۔ کیونکہ میر گواہرام نے شاہ حسین کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اُسے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے میر چاکر کو قتل کرا دے۔ یا کم از کم اُسے پھر واپس بلوچستان آنے نہ دے، شاعر کہتا ہے:۔

دہ صد اشرفی شستاتی
اوگھان ءِ شہ ءَ بکھشاتی
کھت و کاگدے راھداتی
گارکن چاکر ءِ گوں بڑان
آسودگ بیاں چے شڑان
مٹھل ءَ پر پدائی تڑیت
کایان پرتی ءَ گھالی ءَ
چوش رکہ چنگ جنین سوالی ءَ
سال بہ سال دیاں مالی ءَ

یعنی:۔ دگواہرام نے،
ایک ہزار اشرفی
افغانوں کے بادشاہ کو ڈالی بھیج دی۔
اور ایک خط بھی ساتھ بھیجا
چاکر کو اس کے وحشی گھوڑوں کے ساتھ غارت کر دو
تاکہ اس کی شرارتوں سے

مجھے نجات ملے

یا کم از کم اسے واپس آنے نہ دو

میں آپ کے حضور میں

ایک ڈوم گویئے کی طرح

سوالی بن کر آؤں گا۔

اور ساتی بسال مالیہ آپ کو دیا کروں گا۔

تلی کی مشہور لڑائی میں میر گواہرام نے میر چاکر کو تباہ کن شکست دی،
لڑائی میں میر چاکر کے بڑے بڑے رند مارے گئے، اسی لڑائی میں شک
کا حوالہ دیتے ہوئے میر چاکر سے مخاطب ہو کر میر گواہرام کہتا ہے:-

چاکر!

من کہ جو بُشتی کہکرءِ رستان

تئی سرءَ تو پانی ابرپرشتان

یعنی:- چاکر!

میں جو ساون کی گھٹاؤں کی طرح اٹھا

اور طوفان بن کر تجھ پر ٹوٹ پڑا

اور پھر فخریہ انداز میں اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ تم میرا مقا
کیسے کر سکتے ہو جبکہ:-

من سری رندانی تخت گوئیں تاجان

من بلوچانی نامزدین راجان

یعنی:- [illegible] رندوں کا بنیادی بادشاہ میں ہی ہوں

اور میرا ہی قبیلہ بلوچوں کا نامور قبیلہ ہے۔

رند و لاشار قبائل کی روایات جن کا انحصار زیادہ تر ان رزمیہ نظموں پر ہے۔ بتاتی ہیں کہ بلوچوں کے وہ چوالیس بولک یا قبیلے جو ہجرت کر کے ایران سے مکران آئے ان میں رند و لاشار کی تخصیص نہ تھی۔ عرف عام میں وہ سب بلوچ کہلاتے تھے اور میر جلال خان اُن کا واحد سردار تھا، میر گواہرام اپنے چونکہ جلال خان کا جائز وارث سمجھتا تھا اس لئے وہ میر چاکر کو اُن قبائل کا سردار کل، تسلیم نہیں کرتا تھا، وہ اپنے کو بلوچوں کا بڑا سردار اور اپنے قبیلہ نامور قبیلہ سمجھتا تھا، میر چاکر اور میر گواہرام کے درمیان تیس سالہ خانہ جنگی کی بنیادی وجہ یہی تھی، گوہر جتنی کی اونٹنیوں کے بچوں کا واقعہ ایک بہانہ تھا جس نے اندر سلگتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔ بہر حال میر چاکر کی طرف سے نلی کی لڑائی میں نامور رند کام آئے میر گواہرام نے نام لے لے کر اُن کا ذکر کیا ہے۔ یہی بلوچی رزمیہ شاعری کا خاصہ ہے۔ کہ واقعات کے بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتا، شاعر جس طرح کہ اپنے قبیلہ کے بہادروں کی تعریف و مدح کرتا ہے اسی طرح مخالف قبیلہ کے جوانمردوں اور شمشیر زنوں کا نام لے لے کر تعریف کرتا ہے، میر گواہرام کہتا ہے :۔

کشتگ من نامانی ملک میرہان
گوں حاجی شیہک و ہوصر گواہرام
گوں حسن دشتکی ئہ میں بچاّن !
گوں بردو سحرابان پہلوانیان
منی دِل ءَ سکیں درھگئے گوشتہ
عالی گوں بورین کشگ ءَ کشتہ

یعنی :۔

میں نے ہی زامور ملک میر خان کو مار ڈالا

اور اس کے ساتھ

حاجی شیہک کو اور گواہرام کے بیٹے ہومر کو

حسن دشتک کے نو بیٹوں کو

اور دونوں سہرابوں کو جو بڑے بہادر تھے

موت کے گھاٹ اتارا۔

بے شک میرا دل اس وقت شدت سے دھڑکنے لگا۔

جب میں نے عالی کو

اُس کے شوخ بور گھوڑے کے ساتھ مار ڈالا

بلوچی رزمیہ شاعری کا یہ فخریہ انداز بیان میر چاکر و میر گواہرام کے دور کے شاعروں کے کلام میں عام ملتا ہے۔ سلاستِ زبان کے ساتھ ساتھ شاعر فریق مخالف پر فخریہ اور شائستہ انداز سے جسطرح چوٹ کر جاتا ہے، وہ شاعر کی قادر الکلامی کے علاوہ اس کی شائستگی کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ اس کی بات دل کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی نظم میں میدان جنگ سے میر چاکر کے فرار کا ذکر کرتے ہوئے میر گواہرام کہتا ہے :-

چاکر!

تو وتی ساہ پہ اُرجنگ زِیتہٗ

بورت پہ ڈُور ءَ نیمگ ءَ تاچینت

چوگُڈءَ سرپہ تہٗ سری درنگ ءَ

نیلگین گوُرمانی بُن ءَ چِہتہٗ

چوبٹ ءُ ٹبیگان دراں بیتے
آپ چہ سبزین شُتن ءَ پٹنت
چہ قبا ءِ تئی بارگیں چیلاں
چہ سگمار ءُ زرنشتیں مُشت ءَ
چہ کمیت ءِ ابریشمیں بشکان
انگتہ تینگا تشتے لوگ ءَ

یعنی :-

حاکر!
تونے تو کھینچ تان کر
اپنی زندگی ہم سے چھین لی
تم ندی کی طرف اپنا گھوڑا دوڑا کر بھاگے
اور اوپر کی چٹانوں پر سے
پہاڑی دنبے کی طرح
پانی کے نیلے کھڈ کی تہہ میں نیچے جا گرے۔
اور بطخ کی طرح ڈبکیاں کھائیں۔
پانی، تیری سبز قمیص پر سے
تیرے قبا کے درزوں میں سے
تیری تلوار کی سیکار مُشت سے
اور تیری کمیت گھوڑی کے ایال پر سے ٹپکتا رہا
لیکن
تو پھر بھی پیاسا ہی گھر پہنچا۔

بلوچ اگر آج تک خانہ جنگیوں، قبائلی چپقلشوں اور جدال و قتال

بس مبتلا رہے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ اُن کا وہ فعل ہے جسے
شگان کہتے ہیں۔ اُردو میں ہم شگان کو طنز یا طعنہ کہہ سکتے ہیں لیکن
بلوچی کا لفظ شگان اس سے زیادہ تہہ دار لفظ ہے۔ بلوچی کی تمام رزمیہ
شاعری شگان یا طنز سے بھری پڑی ہے۔ البتہ متقدمین ایک دوسرے پر
طنز کیا کرتے تھے وہ بلیغ ہوتی تھی۔ لیکن متاخرین شعرا کے کلام میں
میں بلاغت کی بجائے چھچھورا پن آ گیا، جس سے قبائلی دشمنی اور باہمی کشت و خون
میں شدت آگئی۔ مثال کے طور ملاحظہ ہو کہ میر گواہرام اپنی اسی مشہور رزمیہ میں
میر چاکر پر طنز کرتے ہوئے کیا کہتا ہے:۔

پھر نہ بندے دخوڑ نہ جنڈ بنے !
ھپت زر ذ ہپتاد کوہ بگوازینے
ڈھاڈرے جنپاں پہ سرءَ زیرے !
سر برے استیناں جنے تکھت ءَ
ترا یار میر ہانی بیل نہ بنت جنگی

یعنی :۔

چاکر !
اب تم پھر کبھی فخر سے اپنا سر نہیں ہلا سکوگے
اب اگر تم
سات سمندر اور ستر پہاڑوں کے پار بھی گذر جاؤ۔
ڈھاڈر کی پہاڑیوں کو سر پہ اٹھا لو،
بادلوں کے اوپر اپنا تخت بچھا دو،
تب بھی میر ہان جیسا لڑاکا ساتھی
تمہیں واپس نہیں مل سکے گا۔

میر گواہرام اپنی فتح کی خوشی مناتے ہوئے اپنی طاقت اور ڈھال وتلوار کی کارفرمائیوں کا ذکر جس انداز سے کرتا ہے وہ شگان یعنی طنز ہوتے ہوئے بھی دلپذیر اشعار ہیں۔ لڑائی کے دن کو تلواروں کی خوشیاں منانے کا دن اور فتح کو ڈھالوں کا بڑھنا یا ڈھالوں کی پیش قدمی کہنا ایک بے نظیر استعارہ ہے۔ میر گواہرام کہتا ہے۔

چاکر!
باز ہمارے منی مشکلین کاران
منی سگھارانی شادہ بو روچان
منی ہسپرانی پیش کنزگ وھذرہ

یعنی
چاکر!
تم ان مشکلات کو بہت یاد کرو گے
جن میں میں نے تجھے ان دنوں پھنسا دیا تھا
جب ہماری تلواریں خوشیاں منا رہی تھیں
اور ہماری ڈھالیں آگے بڑھ رہی تھیں۔

بلوچستان میں ان دنوں میر چاکر کو کتنا بڑا اور با اثر آدمی سمجھا جاتا تھا۔ میر گواہرام نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں جن تشبیہات کا سہارا لیا گیا ہے وہ نہ صرف اُس وقت کے بلوچی معاشرہ کے مطابق مناسب اور موزون تھیں۔ بلکہ میر چاکر جیسے ایک باجبروت اور ذی شان سردار کی صورت کشی کے لئے اُن سے بہتر تشبیہ ممکن ہی نہیں تھی۔ شعر کی روانی، بیان کی سادگی اور معنی کی گیرائی وگہرائی اُس صاف وشفاف پہاڑی چشمے کی مثال ہے جو فراز کوہ سے گنگناتا ہوا وادی کی طرف بہتا ہے۔ ملاحظہ ہو میر گواہرام کہتا ہے:

گوشتت:

چاکر شیہک چو سرءِ سئو بنت

من بن ءَ ھُشک ءَ سر ءَ سبزنت

شاھے مِں ہند ءُ شاھے مِں سندھنت

شاھے من دلی ءَ پدرنگ ءَ انت

چیر بنی دیوان ءُ مراگاہ انت!

یعنی:-

لوگ کہتے تھے کہ

شیہک کا بیٹا چاکر

سرو کا ایک ایسا درخت ہے

جس کا تنا خشک اور اوپر کا حصہ سرسبز رہتا ہے.

اُس کی ایک شاخ ہند میں دہلی کی ڈھلوان تک

اور دوسری شاخ سندھ تک پھیلی ہوئی ہے.

اور اُس کے زیرِسایہ

دربار لگتے اور اجلاس ہوتے ہیں.

میر گواہرام کہتا ہے کہ یہ سب کہنے کی باتیں تھیں کیونکہ اب یہی شخص میر چاکر جسے لوگ اتنا بڑا آدمی سمجھتے تھے، میرے قدموں میں گرا ہے میں نے اس کی جڑیں کاٹ کر رکھ دی ہیں. شعر ملاحظہ ہو کہتا ہے.

ترا گُڈ تہ منی پولاتیں تبر زین ءَ

کپتگے گوز پاندہ نگوکر دیم ءَ

نے گواتہت بارت ءُ نہ بارت ملینیت

یعنی:- اے چاکر دیکھ لے کر!
تجھے میری فولادی کلہاڑی نے
کس طرح کاٹ کر رکھ دیا ہے
تم میرے سامنے
سینے کے بل الٹے پڑے ہو
اب ہوا تجھے بلا سکتی ہے
اور نہ ہی سیلاب تجھے بہا کر لے جا سکتا ہے۔

اس نظم میں میرگواہرام کی انانیت عروج پر ہے تشبیہات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

گون من و بیلانی رہ ءَ ترّے
کیٹگی کپا نہت بگلا شان

یعنی:- اے چاکر!
اگر تم پھر بھی باز نہ آئے
اور میرا اور میرے ساتھیوں کا۔
راستہ روکنے کی کوشش کی۔
تو اس دفعہ تربوز کی طرح!
تیرے ٹکڑے کاٹ دوں گا

تیس سال کی اس خانہ جنگی میں رند و لاشار قبائل جسطرح کٹ کٹ کر مرے اور جسطرح یہ دونوں بہادر اور مشہور بلوچ قبائل تباہ و برباد اور منتشر ہو کر سندھ و پنجاب میں بکھر گئے اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ میر چاکر اپنی ایک رزمیہ نظم میں جس طرح حسرت و یاس بھرے

الفاظ میں اس کا بیان کرتا ہے وہ قابل غور ہے. کہتا ہے:

چہ ہپت صد بنگویں ورنایان
کہ پاگش پہ شیبے بستنت
بوران بے لگام ءَ تہتکنت
آیاں پہ نشان یکے نیست
دُرستاں چٹ تگنت ہندیگاں
تیگہاں پہ رہ ءَ زہ بیناں

یعنی :۔ ان سات سو بانکے سجیلے نوجوانوں میں سے
جو اپنی پگڑیاں ایک شان سے باندھتے تھے۔
اور تازی گھوڑیوں پر سوار ہوکر
انہیں بے لگام دوڑاتے تھے۔
آج اُن میں سے
نشانی کے طور پر ایک بھی باقی نہیں بچا ہے۔
ان سب کو ہندی تلواروں نے
اپنی تیکھی دھاروں سے چٹ لیا ہے۔

میر چاکر اور میر گواہرام کی ان رزمیہ نظموں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ نلی کی لڑائی میں شکست کھا کر میر چاکر امداد مانگنے کے لئے شاہ حسین خلجی کے پاس ہرات گئے۔ شاہ حسین نے اسے جو امداد دی۔ اس کا بیان پہلے آچکا ہے خلجیوں کی اس امدادی سپاہ کو ساتھ لے کر میر چاکر نے لاشاریوں پر شبخون مارا، بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ لاشاری بے جگری سے لڑے اور ہزاروں کی تعداد میں

کٹ مرے۔ میر گواہرام لاشاری کا بیٹا میر بکڑ اپنی ایک رزمیہ نظم میں اس شبخون کا ذکر مختصر مگر مؤثر الفاظ میں اس طرح کرتا ہے:۔

ترکان منی براتت بگوین
چہ بامی سران ایر گیجتگنت
لہین دریاب در گیجتگنت
نز آزگنت قوم ءِ قہار
چندی صد و چندی هزار
صبحی بلوچ ڈ، وار تگنت
صبحی تہ زردیٖن دیگرءِ !
بُرت و مزن گوآئیں سگھر
تیگھان کڑلی رتچگنت

یعنی:۔ ترکوں نے میرے بانکے سجیلے بھائیوں کو
بام عروج سے نیچے اُتار پھینکا
اور دریائے خون پر سے کود دادیا۔
قوم کے بہادر افراد
سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں۔
سمٹ آئے۔
بلوچوں ولاشاریوں کو علی الصبح
اس خطرے د حملے کی اطلاع ملی۔
سپیدہ سحر سے غبار آلود عصر تک

تادارین جسموں اور مغرور گردنوں کو
گنے کی طرح کاٹتی رہیں۔

۲- متقدّمین - (دوسرا دور)

میر چاکر اور میر گواہرام کی رزم آرائیوں کے بعد دَورِ متقدمین کی
رزمیہ اشعار میں سُہراب دودائی اور اس کے ہم عصروں کی باہمی چپقلش
سے متعلق رزمیہ نظموں کو بھی بلوچی رزمیہ شاعری میں بلند مقام حاصل
اس دور کے شعراء کی زبان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک انہیں
اور پنجاب میں نقل مکانی کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، اس
کی زبان سلیس اور فصیح ہونے کے علاوہ میر چاکر و میر گواہرام کے دور کے
شعراء کی زبان سے بھی زیادہ بلیغ اور مؤثر ہے۔ اور سندھی اور پنجابی زبانوں
آمیزش سے جو دور متوسطین کے شعراء کی زبان میں در آئی تھی۔ پاک ہے
ملک سہراب دودائی اپنے قبیلہ کے ساتھ ۱۵۰۲ء میں پنجاب میں وا
ہوا تھا، اس سے قبل جو بلوچ ان علاقہ جات ملتان، ساہیوال اور
ڈیرہ غازی خان میں پھیل کر آباد ہوئے تھے۔ اُن کے اور دودائیوں کے درمیان
یہاں بھی قبائلی لڑائیوں کا ایک سلسلہ چل نکلا تھا۔ اس ضمن میں مسٹر لانگورتھ
اپنی کتاب "بلوچ نسل" میں پنجاب میں بلوچوں کی آمد کا ذکر کرتے ہو
لکھتا ہے کہ:-

"۱۳۲۳ء کے مطابق ۸۳۶ھ میں لانگھا نامی راجپوت قبیلے نے حکومت

عرصہ قبل مسلمان ہو چکا تھا، رائے سحرا نامی اپنے سردار کی زیر سرکردگی ملتان میں اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ رائے سحرا نے قطب الدین کا لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا شاہ حسین ۸۷۴ھ میں اُس کا جانشین ہوا۔ جس نے ۹۰۸ھ مطابق ۱۵۰۲ء تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں ملک سہراب دودائی کے ساتھ پہلی بار بلوچ پنجاب میں آباد ہونا شروع ہوتے۔ ملک سہراب اپنے بیٹوں غازیخان فتح خان اور اسماعیل خان کے علاوہ بلوچوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ملتان آیا۔ شاہ حسین نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اور فوجی خدمات کی عوض میں کوٹ کروڑ سے دھنکوٹ تک کا علاقہ اُسے بطور جاگیر دے دیا۔ دوسرے بلوچوں نے سنا تو وہ بھی گروہ در گروہ آنا شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ سیت پور اور دھنکوٹ کے درمیان کے علاقے یعنی موجودہ ضلع مظفر گڑھ۔ دریائے سندھ اور چناب کے درمیان کے تمام علاقے پر قابض ہو گئے۔ فرشتہ اپنی تاریخ میں ان نوواردوں کو دودائی اور بلوچ کہتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ وہ کیچ مکران سے آئے۔

کچھ عرصہ بعد میر چاکر رند اور اس کا بیٹا شاہداد سیوی سے آئے، ملک سہراب دودائی نے حسد کی وجہ سے شاہ محمود کو میر چاکر کی خدمات قبول کرنے سے روکا۔ اس پر جام بایزید نے جس کے ملک سہراب دودائی کے ساتھ تعلقات اس عرصے میں بہت زیادہ تلخ ہو چکے تھے میر چاکر کی حمایت کی۔ اور اسے اپنی جاگیر اُچ میں سے زمین دے دی۔ یہاں سے رند اور دودائیوں کے درمیان دشمنی کی ابتدا ہوئی۔"

ان واقعات نے بلوچوں کی بعض رزمیہ داستانیں ترتیب دیں اور بے شمار ایسی خوبصورت رزمیہ نظموں کے موضوع بنے جو آج تک

---

[1] ڈھکی بلوچوں کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ جو ضلع [illegible] کے [illegible] چرس [illegible] رہے

بسینہ بسینہ منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں:-

بجار پیرذرشہ، بابر سہراب، جونگو نملامو، حیبر دمندر
حاجی خان غازی خان اس دور کے نامدار شعراء اور ان قبائل
رعونہ اور اہم کردار تھے

بلوچ جو مادر وطن بلوچستان کو خیرباد کہکر پنجاب اور سندھ
جاکر آباد ہوئے تھے، ان کے لئے وطن کے معنی اب بدل گئے تھے ان کو
وطن سے زیادہ تلاش معاش کی فکر دامنگیر رہتی تھی اس لئے ایک دفعہ
جب اپنے رند قبیلہ سے ناراض ہو کر الگ ہوجاتا ہے تو اس واقعہ کو اپنی
زرمیہ نظم میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

رِند نہ بیت، دودائی منی برات انت!
کوہ نہ بیت، ہندوستان پرادان انت
چاچڑ ءِ سورین آپ من ءَ دوست انت
من منی بچانی دب ءَ وشّ رانت
دیرنت اچ ترکانی ہوان لتّ ءَ

یعنی:- رند نہ سہی
دودائی بھی میرے بھائی ہیں۔
کوہستان نہ سہی
ہندوستان ایک وسیع ملک ہے
چاچڑ کا نمکین پانی مجھے پسند ہے۔

لہ بلوچی نظام ۔۔۔

اُس کا ذائقہ
میرے بیٹوں کے منہ میں میٹھا ہے۔
اور یہ ترکوں کے حدود سے دور
اس پار ہے۔

اِس دور کی رزمیہ شاعری اُسلوب کے لحاظ سے میر چاکر کے دور کی شاعری سے زیادہ مختلف نہیں البتہ اس دور میں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اشعار میں ہم قافیہ الفاظ سے کام لیا گیا ہے اور زبان زیادہ سلیس اور فصیح ہے۔ مثال کے طور پر بابر کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار اس رزمیہ نظم سے لئے گئے ہیں جو بابر نے اپنی صفائی میں کہی ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ میر سہراب کا بیٹا بابر جو اس نظم کا کہنے والا ہے ایک لڑائی سے بچ نکلتا ہے۔ اس پر فریق فاتح اُسے میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگ جانے کا طعنہ دیتا ہے۔ اُن کے جواب میں بابر ایک طویل رزمیہ میں کہتا ہے:۔

پڑ نہ ئت منی رد چانی کٹور زرین
گواہ منی جونگو اِنت منایانی
پہ چی رنگ بالاد ءَ منی دینئی!
دروگھ نہ بندیت کر کار نہ انت مردءَ
مہتری سالوک دردشمین بچ ءَ
من دتی جنگانی کلات گیرین
گرد گین بگانی پناہ میرین
ریہد ئین چمانی چراگھ تیرین

چھُٹی بِراتانی سنتم زیرین
نینی اِشتاں کہ آ ہری بیسنہ
زیادہ ہیں مٹان تیجگی شینتہ

یعنی:-

میری زندگی کا چاندی کا پیالہ
بھرا نہیں تھا.
بہادر جونگو میرا گواہ ہے۔
وہ بتائے کہ میدان جنگ میں
اُس نے مجھے کیسے دیکھا
وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔
کیونکہ جھوٹ بولنا،
جوانمردوں اور سرداروں کے دولھے بیٹوں کا
کام نہیں ہے۔
میں نے لڑائیوں میں قلعوں کو فتح کرنے والے
اُونٹوں، بڑے بڑے گلوں گلوں کے معتبر محافظ،
سُرخ آنکھوں والے (بہادروں) کی آنکھوں کے چراغ
اور بچپن میں رہنے والے بھائیوں کا غم کھانے والے
(اپنے گھوڑے) کو اُس وقت چھوڑا۔
جبکہ اُس کا آخری دم تھا
اور میں نے اپنے بہت سے دشمنوں کو
تربوز کی طرح کاٹ کر رکھ دیا تھا،

جونگو کو جب معلوم ہوا کہ بابر سہراب نے اُسے گواہ ٹھہرایا ہے تو اُسے یہ بات پسند نہیں آئی، اس نے بابر سہراب کے جواب میں ایک نظم کہی. جس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے

اومنایانی بابرِ شہراب
سندھ گوں شوری ءَ منءَ شتے
گواہی ءَ گالانی اش منءَ پُرسے
گواہ ہمائنت کہ اش پدا دارنت
موہری داگان ءَ نہ گندارنت
من پر آچی ءَ عیب دیان خان ءَ
دو دائی یڑ تگیں بہا دُزنت
لَس کہ من شیران ءِ رستامان ئنت

یعنی :- اے نامور بابرِ شہراب!
کیا تم سندھ سے
مجھے واپس شوری بھیجنا چاہتے ہو.
کہ اپنے اقوال کی سچائی کی گواہی دینے کے لئے
مجھے کہتے ہو.
لڑائی میں گواہی تو صرف وہ لوگ دیتے ہیں
جو پیچھے رہتے ہیں۔
گھوڑے کی باگ
آگے بڑھنے کے لئے ڈھیلی نہیں چھوڑتے

میں (دودائی) خان کو
کیسے عیب لگا سکتا ہوں
جبکہ دودائی سب
ایک جیسے بہادر ہیں۔
اور (شاعروں کے) مدحیہ اشعار میں
سب کی مدح ثنا ہوتی ہے۔

اس قدر کہنے کے بعد جونگو اپنا موضوع بدل دیتا ہے اور بار بار سہراب پر اس انداز سے طنز کرتا ہے کہ اس کی خلش کو صرف ایک بہادر بلوچ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ نظم کی زبان ابتدا سے انتہا تک فصیح، سلیس اور موزون تشبیہوں اور استعاروں کی بھرپور کاٹ رکھتی ہے۔ کہتا ہے :-

اِکدر معلوم اِنت من ءَ اَدّا!
تو ہمرکیبی ءَ گوں ہمبلان کا ہتے!
یانزدہ دیمریگیں بہادراں
من دِل ءَ نیّت و مُراد ایش عنت
کہ شیَبری گھانوئ یگر دینوں

یعنی :- بھائی! مجھے تو بس اس قدر معلوم ہے۔
کہ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ۔
گھوڑوں پر سوار چلے آرہے تھے۔
گیارہ ایک جیسے بہادر تمھارے ساتھ تھے
اور تمھاری نیت اور مقصد یہ معلوم ہوتا تھا۔

کہ اس دفعہ (دشمن کو)
کولھو میں پیس کر رکھ دو گے

شاعر حریف کو یہ نہیں کہتا کہ تم کو لڑنے کا حوصلہ نہیں ہوا اور تم لڑائی سے پشت دکھا کر بھاگ گئے اگرچہ اس کی تشبیہوں اور استعاروں سے جو اُس نے اس نظم میں اس موقع پر استعمال کئے ہیں۔ مطلب یہی نکلتا ہے لیکن شاعر جو خود جونگو ہے برملا اظہار حقیقت کرکے اُسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا، بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ، زبان کی چاشنی سے لطف لیتے ہوئے، اظہارِ مدّعا کرتا ہے۔ اُس دور کے بلوچوں کی یہ ایک ایسی صفت ہے جس سے اُن کے کردار کی پختگی اور بہادر دشمن کی تعریف کا پہلو نکلتا ہے نظم اسی لڑائی سے متعلق ہے جس کی گواہی کے لئے بابر نے جونگو کا نام پیش کیا تھا۔ چنانچہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے جونگو کہتا ہے۔

تو گوترا ہتھ درزیت پدا کزتے
ترا دور کتہ رندی شنذ ہوں بلّان
دشمن ءِ چانپولان ہوا شیفتہ
تو مٹیارے من دمبگ ءِ زرتے
ننگریں پیروز ءِ رن ءِ روچ ءَ
ترا دراپ چہ شیہکت ءِ لڑ ءِ بلیتہ
میلب ءِ شیر بھیمیں ھذا نُندے
تو سرانش سینساران نہ پھرزتے،
ہش دریا بانی لہرو تیلانکان
ترا درمُرتہ پھوان بڑی مینان

یعنی :-

تم ٹکرا کر جلد پیچھے ہٹ گئے
(شاید) تجھے رندوں کے تیزانی دار نیزوں نے
دُکھایا تھا،
یا دشمن کی چانٹوں نے
تجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔

تم اپنی پیٹھ پر بار ملامت لے کر پلٹے
بہادر فیروز شہ کے ساتھ لڑائی کے دن
تم پر شیہکٹ کی،
میلبٹ کے شیر صفت مالک کی
تلوار کا خوف طاری ہو چکا تھا۔
اس لئے تو
تم نے مگرمچھوں اور دریا کی دھکیل دینے والی موجوں کی
پرواہ نہیں کی اور دریا میں کُود پڑے۔
بھوکے مچھیروں نے
تجھے نکال کر تیری جان بچائی۔

اس سلسلے کی ایک دوسری رزمیہ نظم حیبر وسندوست کی ہے۔ بز... کا لڑکا بجار اُسے لڑائی کا پیغام بھیجتا ہے۔ حیبر وسندوست اپنے قب... کے بہادروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :-

پیغام انگلنت رندانی
میلو چادریں مردانی ؛

لے گھوڑی کا نام۔

رنداں رحم جتنے یاد آتکہ
نامی مردکشین بجارِ نت
وادی گوں ملک سہراب ءُ

یعنی:- میلی چادروں والے رندوں کے
پیغام آئے ہیں
(معلوم ہوتا ہے) کہ رندوں میں بھی
ایک شمشیر زن پیدا ہوا ہے
جس کا نام
بہادروں کو مار ڈالنے والا بجار ہے
اور جو
ملک سہراب سے لڑنا چاہتا ہے۔

اُس دور میں اور بعد ازاں بھی بلوچوں میں یہ دستور تھا کہ دشمن کو وقت اور مقام کی اطلاع دے کر لڑنے کو نکلتے تھے، دشمن پر چھُپ کر یا اچانک بغیر اطلاع دیئے حملہ کرنے کو عیب سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف لڑائیوں میں بلوچوں کو سخت ہزیمتیں اُٹھانی پڑیں۔ بلوچوں کے اس دستور کی پابندی اور انگریزوں کی فریب کاری جسے وہ جنگی چال کہتے تھے بلوچستان کی تاریخ میں ناقابل فراموش واقعات کا باعث ہوئی ہے۔ جن کا بیان مناسب مقام پر آئے گا۔ اس وقت سولھویں صدی عیسوی کے ان بلوچوں کے رزمیہ اشعار ہمارے پیش نظر ہیں جو بلوچستان سے نکل کر سندھ و پنجاب

میں حصولِ اقتدار کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں
جس نظم کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اس میں جیئرو مند دوست دودائی
کے پیغام کا ذکر کرنے کے بعد میدانِ جنگ کے تصور میں کھو جا
ہونے والی لڑائی کا نقشہ اس کے ذہن میں کھنچ آتا ہے۔ اس تصور
جس عمدہ پیرایے میں الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ بلوچی رزمیہ شاعر
اپنا جواب نہیں رکھتا، کہتا ہے :-

بانداتہ گُدا روچے کنگ
فوجے چنگیں جنبیئوں
ڈنے درکپوں صحرائیں
ریکی دامنے دیر پندیں
رندو دودوءَ میٹرئوں
مٹ گیجوں گہیں ورنایان
نٹھو، مل بگیرت شہزادءَ
مسکانی وَلی چٹھتءَ !
شمبو، شگریں شوراں ءَ
محمان، اُشتءَ گردینءَ
اِیتی، لشکر وگرانیں فوج
آپ و بنتوی مان آخت
ہوشنگ چوپ کنت پتیءَ

یعنی :- کل جب خدا دن کرے گا

ہم ایک بڑی فوج کو حرکت میں لے آئیں گے
اور صحرا جیسے ایک میدان میں نکل آئیں گے
دُور ریت کے کسی ٹیلے کے دامن میں
رندوں اور دودائیوں کو لڑائیں گے۔
بہادر نوجوانوں کا دو بہ دو مقابلہ کرائیں گے
نتھو، شہزادے سے کشتی لڑے گا۔
مِسکان کا بیٹا وَلی چیٹھا سے
شمبو شوریدہ سر شوران سے
اور محمدان، اَلن پہلوان سے ٹکرائے گا
اُن کا لشکر
اور ہماری بڑی فوج
ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائیں گے
جیسے سیلاب کا پانی بند سے ٹکراتا ہے
اور ایک دوسرے کو اس طرح کوٹیں گے
جیسے جواری کے خوشوں کو کوٹا جاتا ہے۔

یہ تو ہوا دونوں طرف کے پہلوانوں کی دُو بہ دُو لڑائی کا بیان، مگر کیا یہ ممکن تھا کہ حیرد مندوست جیسا ایک بہادر شخص اس میدان جدال و قتال میں دور کھڑا تماشا دیکھتا وہ دودائیوں کا سردار تھا اس لئے اُس نے اپنے لئے رندوں کے اسی مرتبے کے سردار، بجار کا انتخاب کیا، حیرد مندوست نے اسی نظم میں بجار سے اپنی اس لڑائی کا نقشہ جس جادو بیانی سے اثرانگیز

الفاظ میں کھینچا ہے۔ اُس سے شاہنامہ فردوسی میں رستم و سہراب کی لڑ
کی یاد تازہ ہوتی ہے کہتا ہے :-

من گوں باہرانی سیاہ ءَ
دست ءِ نیزگ ءَ لاکی ءَ
پولان و کشاں بجّارءَ
رِندءِ سوھوِیں سردارءَ
باشنتی تفاک ۔ ہنچو بیت
پادءَ پادائی میڑیناں !
جھدی میلویں گوں گیجاں
دست ءَ من گوڑائی پتریناں
تیگھءَ من سرائی بوریناں
چون ءَ گٹّ کناں کاٹارءَ
بڑءوت تاں بر چکءِ رادھیں ءَ
راستیں دست منی حونی بیت
بچّار اَج پُرنگءِ زین ءَ
دسپی من پڑءَ شامی بیت
یا ، مرد اش من و ہندی ءَ
زیری جابہ ءَ رندی ءَ
سوب ءَ پہ تفاکے کیئیت

یعنی :- میں اپنے گلے کی مُشکی گھوڑی پر

سرخ نیزہ ہاتھ میں لئے
رندوں کے فہمیدہ سردار بجار کو
(لشکر میں) ڈھونڈ کر مار ڈالوں گا۔
خدا کرے کہ ایسا اتفاق ہو
اور وہ مجھے مل جائے۔
میں اس کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ کر
اور اس کے لمبے اور میلے بالوں سے پکڑ کر
اپنی تلوار اُس کے سر پر توڑ دوں۔
اور پھر ایک ہاتھ سے اُسے پکڑ کر
دوسرے ہاتھ سے اپنی کٹار
اس طرح اس میں بھونک دوں کہ
قبضے تک اُس کے اندر گھستی چلی جائے
اور میرا دایاں ہاتھ خون سے آلودہ ہو
بجار اپنی نیلی گھوڑی کی زین سے گر کر
میدانِ جنگ میں ابدی نیند سو جائے
یا پھر وہ مجھ سے
میری ہندی تلوار اور زندی ترکش اٹھا لے جائے،
اور اتفاقیہ فتح حاصل کر لے۔

بعض دوسری رزمیہ نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑائی میں جس کا خیالی نقشہ حیبر دمند دست نے کھینچا ہے وہ خود بجار کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس ضمن میں غازی خان (جس کے نام سے ڈیرہ غازی خان آباد ہے)

کے بیٹے حاجی خان نے ایک رزمیہ نظم کہی ہے جس میں اس نے
کے خون کا بدلہ لینے کو اپنے عزم کا اظہار کیا ہے۔ اس نظم میں اپنے و
کے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر حاجی خان کہتا ہے۔

شاہی دو رنگیں بنگلاؤں
جھلہت زاھیفی وس وسان
دردمن سرءِ گنیش انت منءَ
تپسی منی جان متلگی
کنڈ و کہیرین انگری
مومیءَ حل بیت درچیت
من زمگین پیراہن ءَ
پیری نیر بیتہ من ءَ
بوریں حسدی اتگنت

یعنی:۱ اے شاہی رنگ و روپ رکھنے والے نوجوانو!
اب عورتوں جیسے گلے شکوے کرنا چھوڑ دو۔
میرے سر میں بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔
میرا جھومنے والا بدن تپ رہا ہے۔
کھجور کے درخت کے تنے میں لگی ہوئی
آہستہ آہستہ جلنے والی آگ کی طرح
میرا بدن سلگ رہا ہے۔
اور کہیر کے انگاروں کی طرح

۱؎ ایک درخت کا نام جس کی لکڑی جل کر بہت تیز انگاروں میں تبدیل ہوتی ہے۔

آتشِ انتقام میرے دل کو جلا رہی ہے،
میرا بدن موم کی طرح پگھل پگھل کر
میرے نرم پیرہن میں گر رہا ہے،
پرسوں مجھے اطلاع ملی کہ
ہمارے بدترین دشمن آئے ہوئے ہیں۔

حیرِ مندوست کی طرح حاجی خان بھی بجّار کے ساتھ اپنی خیالی
ی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ غالباً اس دور میں رزمیہ گو شعرا کا یہ ایک عام طریقہ ہوتا
، حاجی خان اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوکر اپنے مصمم ارادے کا اسطرح
ر کرتا ہے۔

بیلان! شی اختیاری رات
من عہد گون سرین ءَ بستگاں
چلی سرین بے چارگین!
ڈڈی ڈگھار نیک آلمین
میحان من نیا ماتی جنان

ساتھیو! تمھیں اختیار ہے
لیکن میں نے
ببرشپ کے درخت کے ساتھ عہد باندھا ہے۔
اگر سرشپ کا معذور درخت چلنے لگ جائے۔
اور زرخیز زمین چھوڑنے لگے۔
تب بھی

میں اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا
اور زمین میں میخیں گاڑ کر
اسے روک دوں گا۔

شاعری کو تخیل کی بلند پروازی سے ہی معراج حاصل ہوتا ہے شاعر کا تخیل جس قدر ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے اسی مناسبت سے اس کے اشعار میں ر... تاثر اور فصاحت در آتی ہے۔ بلوچ شاعر اپنے سادہ اور سلیس زبان میں ا... تخیل کو الفاظ کا ایک ایسا خوبصورت جامہ پہناتا ہے جس سے اس کے ک... کا اظہار ہوتا ہے۔ حاجی خان جذبہ انتقام سے سرشار ہو کر میر بجار زند... لڑائی کا جو خیالی نقشہ کھینچتا ہے وہ اس ضمن میں بلوچی شاعری کی ایک... مثال ہے۔ اور اس سے میدان جنگ میں ایک بہادر بلوچ کے جذبات بھرپور اظہار ہوتا ہے کہتا ہے۔

بجار نہ داری اشی پدا
کیت اِنت پر آمیٹر نیگ ءَ
گتاد پہ دمیائیَ درکپان
زنڈین زریان ءَ گون جنان
گلءَ کشائیَ مہمان کنان
تیگہ ءَ ہما ہندائیَ جنان!
تیگھون بگینیت زین کودگ ءَ
ژیل بی، پہ چوک و گردن ءَ
حاکاں بزیری پہ دپ ءَ
مرشِ اِنت منی بڈ ریدو ءَ

حیبرد وزر مشتین لڑے

یعنی:۔ ساتھیو! میں جانتا ہوں کہ
بجار وہاں نہیں رُکے گا۔
لڑائی کے لئے وہ ضرور آگے آئے گا۔
اس وقت،
میں علیحدہ اس کے مقابلے کو نکلوں گا۔
اپنے موٹے گھوڑے کو ایڑ لگا کر
میں اُس پر ٹوٹ پڑوں گا۔
اپنا نیزہ اُس کے پہلو میں اُتار دوں گا۔
اور تلوار اس کے جسم کے اُس حصّے پر ماروں گا
جو اُس کی گردن کاٹ کر
زین کے اگلے سرے (ہرنا) سے پیوست ہو۔
اُس کا سر زمین پر لڑھک کر
منہ سے مٹی اُٹھائے
وہ میرے سردار اور زرمشت تلوار کے مالک
حیبرد کے خون کا بدلہ ہے۔

دَورِ متقدمین کی رزمیہ نظموں میں میر شاہداد کی اُس نظم کو جو "جنگ دہلی" کے نام سے مشہور ہے نہ صرف ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے بلکہ رزمیہ کی حیثیت سے بھی اس کا مقام بلند ہے۔ اس نظم میں ہمایون بادشاہ کے دہلی پر اس حملے کا بیان ہے جس میں سوریوں کو شکست دے کر ہمایون بادشاہ نے دہلی کے تخت پر دوبارہ قبضہ کیا تھا، میر چاکر رند اپنے چالیس ہزار لشکر کے

ساتھ ہمایوں کے ساتھ تھا۔ نظم کا مصنف جیسا کہ ظاہر ہے میر چاکر کا بیٹا میر شاہداد ہے جو خود اس لڑائی میں شامل تھا۔ نظم کی زبان سلیس اور بلیغ ہے۔ عربی اور سندھی زبانوں کی ملاوٹ سے پاک ہے جس سے نظم کی قدامت کا اظہار ہوتا ہے۔ میر شاہداد نے اگرچہ فارسی میں بھی اشعار کہے ہیں اور عربی کے بھی عالم تھے لیکن اس کے باوجود ان کی بلوچی ٹھیٹھ ہے۔ نظم کی روانی، شوکتِ لفظی اور بندش شعری قابل تحسین ہے اور جیسا کہ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے کہا ہے کہ:۔

"جس نظم میں کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی فرضی قصہ بیان کیا جاتا ہے اُس میں مضمون آفرینی اور بلند پروازی کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ مطالب ایسے صفائی سے ادا کئے جائیں کہ اگر اُن مطالب کو نثر میں بیان کیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ واضح، صاف اور مربوط ہو۔ البتہ نظم کا بیان نثر سے صرف اس قدر ممتاز ہونا چاہیئے کہ نظم کا طرز بیان نثر سے زیادہ مؤثر اور دلکش و دل آویز ہو۔"

شاہداد کی اس نظم کو اگر اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو بھی بلوچی رزمیہ شاعری میں ایک ارفع و اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

نظم کی ابتداء فخریہ انداز سے ہوئی ہے جس میں ایک بلوچ کی شانِ خود اعتمادی اور نڈر پن سے میر شاہداد کہتا ہے:۔

شبیری لانگاہان دو زحمینان
ناہر دگنگان سر تمامینان

درکپنت دوډائی پراَزهم ءَ
تگهش مس سبزین آمن ءَ رسته
سرلوکی من کو پکان ارشپته
بکهل و بلگهاران هر ییان
شیبری یتوں ءَ جنون شرتای
شرت کنون تنگو دردشمین بچان
بے مردچ گوں کنگران کایون
بے وتی جیسی چوٹواں باہوں

یعنی:-

اس دفعہ دو دستی تلوار چلانے والے لانگاہ
ناہڑ، خوشحال کنگث اور دوڈائی
تلوار کے جوہر دکھلانے کو نکلے ہیں۔
انہوں نے اپنی تلواروں کو سان پر چڑھا کر
نیلے تھوتھے سے آبدار کیا ہے۔
امیرانہ شان سے
اپنے سر کندھوں پر اٹھائے
ہرات کے مخمل اور ریشم کا لباس پہنے
میدان جنگ میں نکل آئے ہیں۔
یا تو
اپنے لمبے لمبے بالوں والے سروں کو
اور اپنے زر جبین بیٹوں کو
اس لڑائی میں گنوا دیں گے

یا فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے
واپس آئیں گے،

اس شان سے نظم کی فخریہ ابتدا کرنے کے بعد شاعر صرف تین شعر
میں اپنی فوج کی تعداد بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے لیکن یہ بیان ا
جامع اور بلیغ ہے کہ اس کے بعد اس ضمن میں کچھ اور کہنے کی ضرورت
باقی نہیں رہتی۔ کہتا ہے:۔

شیبری زورا کان ہموراج رہ
چل ہزار رند، دی دت سرۓ گون ئنت
کیئت ہمایون گون سے وچار لکھا ل

یعنی اس دفعہ تمام (بلوچ) قبیلوں کے
طاقتور (سردار) جمع ہیں۔
چالیس ہزار رند
اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ ہیں
(ان کے علاوہ)
خود ہمایوں کے ساتھ تین چار لاکھ کی سپاہ ہے۔

اس نظم کی بلاغت پر غور کرنے کے بعد بلوچی کی وسعت اور
رزمیہ شاعری کی گیرائی سے انکار ممکن نہیں ہوسکتا، اس میں شک نہیں
کہ شاہنامہ فردوسی کا شمار دنیا کی بہترین رزمیوں میں ہوتا ہے
نے لڑائی پر جاتے وقت سپاہ کی جو منظر کشی کی ہے وہ بے نظیر
لیکن بسا اوقات اس عظیم شاعر نے پیرایۂ بیان میں جو مبالغہ آرائی کی

وہ دروغ بیانی کی انتہائی حدود سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ بلوچی شعرا کے نزدیک اس قدر غلو جائز نہیں ہے۔ بلوچ شاعر صرف وہ بات کہتا ہے جو اس نے سنی ہے۔ وہ واقعہ بیان کرتا ہے جسے اُس نے خود دیکھا یا خود اس پر گذرا ہے۔ اور اسے بس اس قدر بناتا، سنوارتا اور مبالغہ آمیزی سے رنگ دیتا ہے کہ صریح جھوٹ نہ لگے۔ بلوچ شاعر کے ہاں ایک تو جھوٹ معیوب ہے، اور دوئم یہ کہ اسے اس بات کا بھی احساس رہتا ہے کہ جو کچھ وہ آج کہہ رہا ہے وہ کل اس کی قومی یا قبائلی تاریخ کا جزو بنے گا اور جس سے اس کی آئندہ نسلیں اکتساب کریں گی۔

شاعر نے ہمایوں بادشاہ کی سپاہ کی تعداد بیان کرنے کے بعد اس کی وسعت و قدرت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں مبالغہ کا عنصر بہت کم ملتا ہے تشبیہہ اور استعارے عام فہم اور بلوچی ماحول کے مطابق ہیں، کہتا ہے:

اُرد ہمایون ءِ بازو بے گانج اِنت
دھرتی ءَ سایا شدّھویں بلّ ئُنت
مُرگھ مس بلّانی سرءَ نشتنت
آہو مس اُردءِ نیامگءَ گپتنت
من ڈگھار جاگاءَ نہشت پادءِ
ہند نہشت مردءَ دزیان ءَرا

یعنی:- ہمایوں کی سپاہ بہت اور بے حساب ہیں
اُن کی نوکدار نیزوں سے
زمین پر سایہ ہو جاتا ہے۔

پرندے نیزوں پر بیٹھتے ہیں۔

ہرن سپاہ کے درمیان آکر پکڑے جاتے ہیں۔

آدمیوں اور گھوڑوں کی کثرت سے

زمین پر پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔

طبل جنگ بج اٹھتے ہیں۔ اس وقت مردانِ کارزار کی جو کیفیت ہوتی ہے اُس کی صحیح ترجمانی صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس پر خود گزری ہو۔ حقیقت بیانی بلوچ شاعری کی خاصیت ہے اور اس خاصیت سے دستبردار نہیں ہوتا۔ شاعر اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے

درکپیت روچ چہ تنگویں بُرجان

گوانک کتہ وت رودیں دماموان

روچ درآتکہ و فوج پیداک بنت

پوزیں رند پہ ڈیگا کھتکنت

چاکر دترکان دی مقابل بنت

ما خیالانی دِل نہ چنڈ بیستہ

مں مدا آمان انت شُمے بالاد

گوں جن وتنگو دردشمین بنچان

شرت آہور ھلیسی چوٹواں بیستہ

یعنی:۔ سُورج جب طلائی برج سے طلوع ہوا۔

جنگ کے طبل بج اٹھے

طلوع آفتاب کے ساتھ (دشمن) کی فوج

بڑھتی ہوئی نظر آئی۔
رند کے بیٹے بھی
دوڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگے،
آج میر چاکر اور ترکوں کا مقابلہ ہوگا،
اس سے ہمارا دل نہیں دھڑکتا
اے بہادرو!
آج تمھارے قدو بالاد
تمھاری بیویاں اور زرجبین بیٹے
خدا کی امان میں ہیں
آج تمھارے سروں کی بازی لگی ہے

بلوچ شاعر مبالغہ نہیں کرتا، جو کچھ دیکھتا ہے اسے سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرتا ہے۔ طبل جنگ بج اٹھے، دونوں لشکر آمنے سامنے آئے اور لڑائی شروع ہوئی۔ اس حالت میں شاعر، جو خود لڑائی میں شامل ہے۔ ایک ہوشیار اور چوکنے مرد میدان کی طرح چاروں طرف اپنی نظر رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو کہ میدان جنگ کا نقشہ کس باریک بینی اور فنکاری سے کھینچتا ہے۔

تاں گوئرا آتکنت گوں کابلی تُرکاں:
مچگ جنگ گوں توپک ءُ تیران
پہ سگھاران و سارؤین لیلان
دیر نہ بیتہ، داں دم ءُ دھکے
آپ و شیر بتیہ داں دماں یکے

من نظر کت گوں رہیدگیں چمّان
پلوے میرءِ لشکرءِ پرشتہ
دھنرے اچ میرءِ بیرکءِ گوئستہ

یعنی:- آخرکار وہ کابلی ترکوں (سوریوں) سے ٹکرا گئے
لڑائی کی ابتدا
بندوقوں کی گولیوں سے ہوئی۔
اور پھر سمند گھوڑوں کے سوار
تلواریں سونت کر پل پڑے۔
زیادہ دیر نہیں گذری کہ
پانی اور دودھ (پسینہ اور سفید جھاگ)
سُرخ خون کے ساتھ مل کر بہنے لگا۔
اب جو میں نے
اپنی سُرخ آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔
میر (چاکر) کے لشکر کا ایک حصّہ
ٹوٹ کر بھاگ رہا ہے۔
اور ان کی اڑائی ہوئی گرد
میر (چاکر) کے جھنڈے سے بھی گذر چکی ہے

یہاں پر اس امر کی طرف توجہ دلانا مناسب ہوگا کہ دورِ قد[یم]
کے اکثر اور متوسطین و متاخرین کے چند ایک بلوچ شعراء سوریوں، خلـ[جیوں]
ارغونوں، لودھیوں غرضیکہ شمال کی طرف سے آنے والے تمام حملہ آ[وروں]

کو ترک کہتے رہے ہیں، اُن کے نزدیک غالباً ہر سرخ و سفید اور لڑا کا ترک تھا، یہاں تک کہ بعض شاعروں نے انگریزوں کو بھی ترک کہا ہے جیساکہ گِدُو ڈُدم انگریزوں کے ساتھ مریوں کی لڑائی سے متعلق اپنی مشہور رزمیہ میں کہتا ہے۔

ہما ماتوں ، ہما گِٹ انت
ہما ترکانی آھلٹ اِنت

یعنی:۔ وہی ہم ہیں اور وہی گھاٹیاں ہیں۔
اور وہی ترکوں کے ساتھ ہماری لڑائی ہے۔

"جنگ دہلی" کی اس نظم میں شاہداد کی بلوچیت یا بلوچی انانیت زیادہ نمایاں ہوئی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ بلوچوں کے لشکر کا ایک حصہ ٹوٹ کر بھاگ رہا ہے تو پہلی نظر میں اُسے تعجب ہوتا ہے کہ بلوچ میدانِ جنگ سے کیسے بھاگ سکتے ہیں۔ لیکن پھر وہ بھاگنے والوں کو جلد پہچان لیتا ہے۔ میر چاکر کے لشکر میں صرف بلوچ ہی نہیں تھے بلکہ بعض دوسرے غیر بلوچ قبائل کے افراد بھی شامل تھے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

زور کتہ دلی ءِ پوتریں ترکان
اُردی اَچ نچینیں پھلوءِ پُرشتہ
چنڈے اَچ میرءِ نیمگ ءَ رکنتہ
پرشتگنت ردگال دمیرال حابیں
رِند نہ کنزنت چہ موزگی پینزءَ

یعنی:۔ دہلی کے ترکوں کے بیٹوں نے دباؤ ڈالا

تو اس کے لشکر کے بائیں بازو کا ایک حصّہ ٹوٹ گیا،
ان میں سے کچھ میر (چاکر) کی طرف
پیچھے ہٹ گئے
یہ پیچھے ہٹنے والے
غلام اور کالے نقیب تھے
یا غیر بلوچ اور ناتجربہ کار میر عالی!
رند تو میدانِ جنگ سے
اپنی ایڑی بھی پیچھے نہیں ہٹاتے

بلوچ شاعر جیسا کہ اس رزمیہ نظم سے ظاہر ہوتا ہے نہ صرف میدانِ جنگ میں تلوار چلاتا ہے بلکہ ساتھ ہی ان تمام واقعات پر بھی نظر رکھتا ہے جو میدانِ کارزار میں جوانمردوں کو پیش آتے رہتے ہیں۔ بہادر، دادِ شجاعت دیتے ہوئے لڑائی میں کام آتے ہیں۔ بزدل پیٹھ دکھا کر میدان جنگ سے بھاگ جاتے ہیں۔ دشمن آگے بڑھتا ہے، شہسوار جھپٹ کر اسے روکتے ہیں۔ اور جان کی بازی لگا کر اُسے پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ کسی شمشیرزن کی تلوار ٹوٹ جاتی ہے تو نیزہ سنبھالتا ہے اور زخم کھا کر گرتا یا دشمن کو پچھاڑ دیتا ہے۔ غرضیکہ شاعر کی عقابی نظروں سے میدان جنگ کا کوئی واقعہ پوشیدہ نہیں رہتا۔ اس لڑائی میں جو واقعات پیش آئے میر شاہداد کی برابر اُن پہ نظر رہی ہے۔

بلوچ لشکر کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ اپنے وطن میں اس قسم کی بڑی لڑائیوں میں کود پڑنے سے قبل بلوچ اپنی عورتوں اور بچوں کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیتے تھے۔ جیسا کہ ذوالنون بیگ ارغون کے حملے کی

خبر پا کر میر گوا ہرام لاشاری کی والدہ نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ

گنداں کہ ترا نیست راہے
کرکن توئر پگر جنگ جائے
تچان ، برز ترین کوہان پر
مالان کھنڈگ ءَ آدیم کن

یعنی:- بس دیکھ رہی ہوں کہ
اس کے بغیر تیرے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں۔
کہ رستے سے ہٹ کر،
اُن سے لڑنے کیلئے کوئی جگہ تلاش کرلے،
اپنے بال بچوں کو
اونچے پہاڑوں پر پہنچادے،
اور مال ومویشیوں کو
گھاٹیوں کے اُس پار کردے۔

لیکن یہاں صورت دوسری تھی، لڑائی ملک سے سینکڑوں میل کی مسافت پر ہو رہی تھی۔ بال بچے جو ساتھ تھے اُن کو پیچھے نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ خدا جانے لڑائی کی صورت کیا ہو، کس کی جیت ہو اور کون ہارے۔ تب اس حالت میں اہل وعیال کا ساتھ رکھنا مناسب تھا، بہر حال شاعر کہتا ہے کہ جب میر جاکر کے لشکر کا ایک حصہ ٹوٹ کر بھاگنے لگا تو:-

جُمپ جتہ مائی بانڑی شیہک
دستی گون باتیلکان تشتنت پُرزا

پُر زشتگنت اُچیَ نہ تلیں باَئینک
ہوئے ہوئے لجانی سرءَ انکھ

شہک کی بیٹی مائی بانڑی — یعنی:۔
محمل سے چھلانگ لگاکر
نیچے زمیں پر کود پڑی۔
اپنے دونوں بازوؤں کو،
جن میں نُو نُو خوبصورت چوڑیاں تھیں۔
ادپر اٹھاکر اپنی چوڑیاں توڑ دیں
عورتوں میں کہرام مچ گیا

عورتوں کی چیخ و پکار سُن کر رند پلٹ گئے پار تھینزنوں کی طرح بلوچوں
بھی یہ دستور تھا کہ جب لڑائی میں اُن کو یہ گمان گذرتا کہ میدان جنگ
سے ان کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں تو اپنے گھوڑوں پر سے اُتر جاتے
کا مقصد یہ ہوتا کہ وہ کٹ مریں گے لیکن پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ بلوچ
کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:۔

گڑ کتنت رندان پہلوانینان
اچ سرءَ میرہان دمر یدکھتکنت!
بوران گوں تاسیں دوروان اشتنت
گوں پدی را پچیان طروکینان
زہم جنگ رندو بارگیں بوران
جگیھ بلوچانی لیسلوین جانان

یا مگھولانی ہل و منـدیلان
زہمش ماجا ہیں کو پگان داشتوں
من وتی منـدیلاں بلوچینان

یعنی :۔ بہادر رند پلٹ گئے
سب سے پہلے میر ہان و مرید آئے
انہوں نے اپنے تاس رکاب گھوڑے
پیچھے رہنے والے خدمتگاروں کے پاس چھوڑ دیئے۔
پتلی گھوڑیوں والے رندوں نے
اب تلوار چلائی
بلوچوں کے سڈول جسم خون سے رنگین ہوتے رہے
یا مغلوں کی فولادی ٹوپیاں۔
اور زرہ بکتر کٹتے رہے
اُن (مغلوں) کی تلواریں
ہم (بلوچ) اپنے مضبوط کندھوں
اور فولادی بلوچی ٹوپیوں پر روکتے رہے۔

بلوچی رزمیہ شاعری میں جزئیات کا بیان جس طرح سے ہوتا ہے وہ عربوں کی زمانہ جاہلیت کی شاعری سے کسی قدر مشابہت رکھتا ہے لیکن ہم اسے عربی شاعری کی متابعت نہیں کہہ سکتے۔ بلوچی شاعری کا انداز بیان جداگانہ اور اس کے اپنے قبائلی اور ملی کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے وہ عربوں کی طرح فخر و مباہات کی اُن بلندیوں تک نہیں پہنچتی جہاں سے تکبر و غرور

کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ بلوچ تکبر و غرور کو بری بات سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ تکبر سے شکست ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حمل جیئند جب پرتگیزوں سے لڑائی میں شکست کھا کر گرفتار ہوتا ہے تو شاعر اُسکی اِس گرفتاری کو تکبر کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

حمّل ءَ پہراں گپتگ دشمیں گھیبتان
حمّل ءَ پہرے مس پتی باری ءَ کتہ

یعنی:۔ حمّل کو تکبّر اور بڑھ نے مارا۔
حمّل نے اپنے باپ کے دور (سرداری) میں
ایک دفعہ تکبّر کیا تھا۔

دہلی کی اس تاریخی لڑائی میں بلوچ بہت بہادری سے لڑے اور بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ وہ اس لیے جگری سے لڑے کہ دشمن اُن کے مقابلے سے بھاگتے ہی بنی۔ وہ ہمایونی سپاہ کے ساتھ فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے پایہ تخت دہلی میں داخل ہوئے۔ اس کامیابی پر شاعر جتنا بھی فخر کرتا کم تھا، لیکن اس نے اس موقع پر بھی حقیقت بیانی سے تجاوز نہیں کیا، کہتا ہے:۔

پروشِں کتنت دِلّی ءَ ترک حرام خورین
فوجش گراں میں ماہپت سری پروشتگ
سی ہزار نرشیری گڈا کینتین!
سرش ماجہل من جندرءَ دَرگشتین
دہ ہزار شر طلیے کشاتین!

بٹریین دِتی رو کوٹ ہزار گنجین!
اووان ہشت پہرءَ ماڈیرد ءَ واین
مرد قرار بنت و بور بسا سارنت
گوشل تما سا سارنت دمے نوکین
سو مش آچ سیمیں ھُکماں دیر بنت

یعنی :- دھلی کے حرام خور ترک (سوری) شکست کھا گئے
اُن کی کثیر تعداد فوج کو
ہم نے سات ٹکڑیوں میں کاٹ دیا
اُن میں سے تیس ہزار کو
ہم نے شیر کی طرح چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔
دس ہزار ہمارے وہ نوجوان بھی مرے۔
جنہوں نے اپنے سروں کی بازی لگا دی تھی
ہم نے دہلی کے مال و دولت سے بھرے قلعے کو لوٹ لیا۔
ہم نے آٹھ پہر وہاں پر ڈیرہ ڈالا۔
تاکہ ہمارے جواں مرد آرام کریں۔
اور گھوڑے دم لیں۔
کھڑی کانوں والی گھوڑیاں تازہ دم ہوں
اور اُن کی پیٹھوں پر سے سوجن دُور ہو

۳۔ متقدمین (تیسرا دور)

بالاچ گورگیج کا شمار متقدمین کے آخری دور کے شعرا میں ہوتا ہے بالاچ کی رزمیہ شاعری کی نمایاں خصوصیت اُس کا قومی جذبہ ہے۔ بالاچ سے قبل کے تمام بلوچ شعراء ذہنی طور پر قبائلیت سے آگے نہیں سوچ سکتے تھے، اگرچہ اُن کے ہاں بھی کہیں کہیں قومی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس حد تک والہانہ فخر و محبت سے نہیں جس قدر بالاچ کے ہاں پایا جاتا ہے بالاچ نے ایک بلوچ کی حیثیت سے جن باتوں پر فخر کیا ہے ان کی حقیقت کو صرف ایک بادیہ نشین بلوچ ہی جان سکتا ہے۔ اس لئے آج بھی بالاچ کے اشعار بلوچوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں

بالاچ بلوچ کے دل کی دھڑکنوں کو سنتا اور ان کی ترجمانی کرتا ہے بلوچ بیر یا انتقام لینے کو اپنا قومی اور ملی فرض سمجھتا ہے اور جو شخص اس فرض کی بجا آوری میں کوتاہی کرتا ہے وہ بلوچ کی نظروں سے گر جاتا ہے بلوچ معاشرہ میں اسے حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ملا اسماعیل اپنے دشمن پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

تو بیرگ ءَ بیتگے شمس دین گڈی اللہ یار
باجو بوالخیرءَ چید گہت سنگے کت سوار
گزءِ چنوءَ چورگ وبے ماتین گہار
تاکہ بیت پشتءَ ترا لگہتہ پولنگ و شیار

۱۰۹

یعنی:- تم تو بالکل شمس دین اور آخری اللہ یار بنے ہو۔
تم باجو لوانخیر سے بھی ایک ہاتھ بڑھ گئے ہو۔
اور گزو چنو کی سوتیلی اور یتیم بہن سے بھی گئے گذرے ہو
تجھے بدنامی کا داغ
سات پشتوں تک لگ چکا ہے۔

یہ سب افراد جن کا ذکر اوپر شعر میں آیا ہے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے بلوچ معاشرتی اصولوں کے خلاف بے غیرتی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً شمس دین کی پناہ میں ایک ایسا شخص آیا جو قتل کرکے بھاگا تھا اس کے دشمنوں نے شمس دین کے گھر میں آکر اس کے باہوٹ کو قتل کر دیا۔ شمس دین اس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ اور نہ ہی وہ حملہ آوروں کے خلاف لڑ سکا۔ اس لئے بلوچ معاشرہ میں شمس دین معتوب ٹھہرا۔

اللہ یار نے ایک قاتل کو جو اُس کی پناہ میں آیا تھا، مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا جنہوں نے اُسے قتل کر دیا، اللہ یار اس لئے بدنام ہوا

باجو لوانخیر ایک شخص کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ اس کے ہمراہ کے دشمنوں نے حملہ کرکے اسی ہمراہ کو قتل کر دیا باجو لوانخیر نے اپنے ہمراہ کی کوئی مدد نہیں کی۔ خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ اس لئے رسوا ہو گیا۔

گزو چنو نے اپنے بھائی کے قاتلوں سے صلح کر لی۔ لیکن اسکی سوتیلی اور یتیم بہن نے قاتلوں میں سے ایک کو قتل کرکے اپنے بھائی کا انتقام لے لیا۔

بلوچ معاشرہ میں قاتل سے صلح کرنا ایک انتہائی معتوب فعل سمجھا جاتا ہے اس لئے ایک بلوچ شاعر اپنے دشمنوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ہم اپنے انتقام سے صرف اس وقت دستبردار ہوں گے جب:-

دست ءِ دل پُٹے و مید بیارنت
کڑاکو کین گرّاغ شیر بیارنت
لہدی نر مزار لاہو بنت!
آسکل کہول وچیپنی بنت
گزان کننگ و ماران پاد!
پرجی پہ ڈگھارءَ جزنت !
میر جتّیان بہنت لنگاران
گوءَرکان جتّنی چارینت

یعنی :-

ہتھیلی پر بال نکل آئیں۔
جنگلوں کے ببر شیر پالتو بن جائیں۔
ہرنوں کے پشم نکلیں اور اُن کو کترا جا سکے،
لئی کے درختوں پر کانٹے
اور سانپوں کے جسم پر پیر نکل آئیں۔
کشتیاں زمین پر تیرنے لگیں،
ساربان ہل چلانے لگیں۔
اور اُن کی بیویاں بھیڑوں کے بچّوں کو چرانے لے جائیں

اسی موضوع پر ملّا رگھام وشتی اپنے ممدوح کی طرف سے اُس کے دشمنوں کو خطاب کر کے کہتا ہے :-

اگر سر تیپ ظالم چو کیان بیت
گہیں دھکان پہ ملکان کامران بیت۔

گرنشو کیبن نورِ محمد زندہ جان بیت
بلند آوازیں دیوان و سرٹپان بیت
شگھال مُرگوِ گٹیانی شبان بیت
گٹیٹے ہم نشینِ کرگزان بیت
بلنگے اُشترانی ساربان بیت
شپ ببیت دنہم گرماہگان بیت
وَروکیں گرگ نگہبانِ پسان بیت
پس ءِ اولاد چو بزءِ شوشگان بیت
اگن پشتیگ پیگ ءِ پاسبان بیت
اگن آچش گوں پنبگ ہلسان بیت
اگن آہو گوں شیرءَ ہمکران بیت
اگن سیمرگھ دانہ، گو چران بیت
پشہ سلطان رومءَ کامران بیت
ہشاش چو ڈھاڈری جنپان کلان بیت
ہمت چو اُرزن ءِ دان ءَ گسان بیت
زرءِ آپ ھُشک دراہ پہ گردگان بیت
اگن دریا فنا و رود رہان بیت
زرءِ ماہیگ پہ آڈنان تیچان بیت
اگن عقرب گوں پورءَ جی دجان بیت
اگن دجّال گیت سوارِ حران بیت

ولات یاجوج و ماجوج ءِ مکان بیت
ڈگھار بارگ چو تارِ ریسمان بیت
منی بُغض و حسد اُوداں زیان بیت
پدا مٹیگ و تئی صُلح و تران بیت

یعنی :- اگر ظالموں کا سپہ سالار
مظلوموں کا محافظ بن جائے۔
اگر دہقان ملک کی حکومت حاصل کرنے میں کامیاب
اگر شاعر نور محمدؒ[1] پھر زندہ ہو جائے
اور محفلوں میں شاعروں کی قطار میں بیٹھ کر
بلند آواز سے اپنے اشعار سُنانے لگے۔
اگر گیدڑ پرندوں کی رکھوالی کرے۔
اگر گندگیوں میں دانہ چگنے والا مرغ
لکھنے پڑھنے لگ جائے۔
اگر کبوتر گدھوں کی ہم نشینی اختیار کرے
چیتا اونٹوں کا ساربان بنے۔
استیسوشؒ[2] کی رات کو چاندنی ہو۔
درندہ بھیڑیا بھیڑوں کا نگہبان بنے
بھیڑ کی اولاد جنگلی چیتے بن جائیں۔
اگر بلی چھچھڑوں کی پاسبان ہو۔

---

[1] مشہور شاعر نور محمد بمپشتی مرحوم۔

اگر آگ روئی کے ساتھ آسے نہ جلانے کا سمجھوتہ کرے،
اگر ہرن شیر کے ساتھ مل کر رہ سکے۔
اگر سیمرغ مرغی کی طرح گندگی میں سے دانہ چگنے لگے،
اگر مچھر سلطان روم کو شکست دے سکے
اگر خشخاش کا دانہ ڈھاڈر کی پہاڑیوں جتنا بڑا ہو۔
اگر ہمنتؔ کا پہاڑ ارزن (چینا)، جتنا چھوٹا ہو سکے۔
سمندر کا پانی خشک ہو۔
اور اس پر چلنے پھرنے کا راستہ بن جائے۔
اگر دریا سوکھ جائیں
اور بہتے رود گذرگاہیں بن جائیں۔
سمندر کی مچھلیاں میدانوں میں دوڑنے پھرنے لگیں۔
اگر زحل اور مشتری ایک برج میں آکر
خوشی خوشی مل جائیں۔
اگر دجال گدھے پر سوار ہو کر آجائے
اور دُنیا پر یاجوج ماجوج کا قبضہ ہو جائے۔
اور زمین رسّی کی ایک تار کی طرح پتلی ہو جائے۔
تب تیرے خلاف بغض و حسد میرے دل سے نکل سکے گا
اور اُس کے بعد
ہمارے درمیان صلح کی بات چیت ممکن ہو سکے گی

ؔ ایک پہاڑ کا نام۔

بلوچ اپنے خون کا بدلہ لینا کئی پشتوں تک نہیں بھولتا، مثال کے ل

شاعر کہتا ہے:۔

ہون بلوچانی تن دو صد سال ءَ!
لسہ ئیں آہو تنت دو ذتانیں
سنگ اُگن چاہتانی بن ءَ رِزیت
گینگ چہ مردانی دل ءَ کنزیت

یعنی:۔

بلوچ کے خون کا انتقام دو سو سال تک
دو سالہ ہرن کی طرح ہوتا ہے۔
اگر کنویں میں پتھر گل سکتے ہیں۔
تب جوانمردوں کے دلوں سے
انتقام کا جذبہ ہٹ سکتا ہے۔

بلوچوں کی رزمیہ شاعری انتقامی لڑائیوں کے بیان سے بھ
ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں جو بلند مقام بالاچ کی شاعری کو حاصل ہے اور ج
کشی اور بہادری سے بالاچ نے اپنے بھائی دودا کا انتقام لیا ہے۔ بلوچستا
اس کی نظیر ملنی مشکل ہے اس لئے بالاچ ، بلوچوں کے ہاں "بیرگ
انتقام لینے والا" یا "منتقم" کے نام سے مشہور ہے۔

بالاچ صرف ایک نڈر اور منتقم بلوچ نہ تھا بلکہ اعلیٰ پایے کا
بھی تھا اس کی زبان صاف، سلیس اور انتہائی حد تک موثر ہے۔ تش
و استعارات بلوچی ماحول کے مطابق اور قابل فہم ہیں۔ چنانچہ ایک

ں بلیدیوں کے گاؤں میں اس کی وجہ سے عورتوں میں جو خوف پھیلا
تھا اس کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

اے مُرگھ کہ شپان نیم بالنت
بالاچ ءِ کمان ءِ تیر ءَ نت!
گوکان مڑ کننت من ہلکان
واب جہجنت نیاڑیان
کھلّ ءِ سچّہ ئیں مائیان
وُش دش ءَ گو ئشنت گون جوان
بس کن درھگنت بالاچ ءِ

ینی:۔
رات کو جب پرندے
نیچے پرواز کرتے ہوئے گذرتے ہیں
تو بلیدیوں کی عورتیں
(اپنے خاوندوں سے) کہتی ہیں۔
سنو! بالاچ کے تیروں کی آواز آرہی ہے
اور جب گاؤں میں رات کو)
بیل آپس میں لڑتے ہیں۔
تو گھروں کی پاک دامن بی بیاں
نیند سے اُچھل پڑتی ہیں۔
اور آہستہ سے
اپنے خاوندوں سے کہتی ہیں۔
خاموش رہو

بالاچ کے پاؤں کی آہٹ ہے

اسی سلسلے میں بالاچ اپنی ایک دوسری نظم میں اُن جوانمردوں کی جو
بیان کرتا ہے جو اپنے خون کا انتقام لینے کو نکلتے ہیں کہتا ہے:

آمرد کہ حونان ءَ گرنت
بیزار چہ ذالان ءَ کننت!
دراَیں شپان بیدار بنت!
چو عاشقان آہ آہ کننت
پہ دشمنان نیشان درشنت
آمرد دَتی حونان گرنت
یا ہیبی سران زیان کننت۔

یعنی جو لوگ اپنے خون کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔
وہ اپنی بیویوں سے دور بھاگتے ہیں۔
اپنے مال و مویشیوں کی محبت چھوڑ دیتے ہیں۔
راتوں کو بیدار رہتے ہیں۔
عاشقوں کی طرح سرد آہیں بھرتے رہتے ہیں
دشمنوں پر دانت پیستے ہیں
یہ لوگ ہیں جو
اپنے خون کا انتقام لیتے ہیں
یا اپنے سر گنوا دیتے ہیں،

اس کے ساتھ ساتھ بالاچ اس شخص کو جو دشمنوں سے انتقام لینا چاہتا
ہے جو اس کا قومی فریضہ ہے، یہ ہدایت بھی کرتا ہے کہ:۔

سانگ ءَ مزیہ چہ دشمنان
تران ءَ چرا جورین بدان
آخرِ کہ تو زَد بےَ چدان

یعنی :- دشمنوں سے ناطہ مت کرو۔
اُن کی بات نہ سنو،
ورنہ دھوکہ کھا جاؤ گے

بالاچ کی شاعری ایک ایسی آگ ہے جو اس کی نظمیں سننے کے بعد ہر منتقم بلوچ کے دل میں بھڑک اٹھتی ہے، جب تک بالاچ کی یہ نظمیں بلوچوں کی شبینہ محفلوں میں گائی جائیں گی، نوجوانوں کے دلوں میں یہ آگ بھڑکتی رہے گی،

بالاچ اپنی نظموں میں اپنے بھائی دودا کا مرثیہ نہیں کہتا، بلکہ انتقام کی جو آگ اس کے دل میں لگی ہے اُسے ہر بلوچ کے دل میں لگانا چاہتا ہر اس کی انفرادیت، اجتماعیت کا مظہر بنتی ہے۔ بالاچ اپنی نظموں میں گورگیج نہیں رہتا، بلکہ بلوچ بن جاتا ہے اس کی فکر غم جانان کی تنگنائے میں مقید نہیں رہتی، بلکہ غم دوران کی وسعتوں میں ڈوب کر ابھرتا ہے اُس نے اپنے بھائی دودا کا انتقام لینا ہے۔ لیکن اس جذبہ انتقام کو وہ بلوچ کی ملی خصوصیت اور معیار کا مظہر قرار دیتا ہے۔ اس لیئے بلوچیت کا گیت گاتے ہوئے کہتا ہے:۔

کوہ تنت بلوچانی کلات
انبارش بے راہیں گرنت
برزیں ہشی اش سائگنت

آپش بہوکیں چمگنت!
کوڈی اِش پیش ءَ کنڈلنت
لشتیں جہش کھرکاوگ ئنت
بوپ ءَ بدل سیزیں سکنت
سنگش تلشمپیں، سرجگنت
پورش سپتیں چبوّ ئنت
بچیش گچیں گونڈل ئنت
براتش تلارین اسپرئنت
براہ زھگش شلین خنجرئنت
ھارنیش سیوائی جگنت
زاماتش مرد وارین لڑنت

یعنی:-

پہاڑ بلوچوں کے قلعے ہیں۔
دشوار گذار اور بے راہ گھاٹیاں ان کے گودام ہیں۔
وہ اونچی چٹانوں کے سایے میں بیٹھتے ہیں۔
اور بہتے چشموں کا پانی پیتے ہیں۔
پیش کے پتوں سے اپنے آب خورے بناتے ہیں۔
خار دار جھاڑیوں میں بیٹھتے ہیں
پہاڑی ندیوں کی باریک کنکریاں
ان کے لئے گدیلوں کا بدل ہیں
اور صاف پتھر ان کے سرہانے ہیں۔

(کچے چمڑے کی) سفید چپلیاں اُن کے گھوڑے ہیں

اچھے خدنگ اُن کے بیٹے ہیں۔

چکنی اور سخت ڈھالیں ان کے بھائی ہیں۔

نوکدار خنجر اُن کے بھتیجے ہیں۔

سیوائی کمان اُن کے باپ ہیں۔

اور جوانمردوں کو کاٹنے والی تلوار ان کے دادا ہیں۔

بالاچ کی رزمیہ نظموں میں منظر کشی اور جذباتیت کا ایک ایسا امتزاج پایا جاتا ہے جس سے نظم کی رنگینی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ سامع کے دل میں انتقام کا جذبہ بھی شعلۂ جوّالہ بن کر بھڑک اُٹھتا ہے۔ دودا کی موت کے بعد اس کی بیوی، بچوں اور گھوڑوں کو دیکھ کر بالاچ کے دل میں جذبات کا جو طوفان اٹھتا ہے اس کا اظہار اس نے جس خوبصورتی اور آتش افشانی سے کیا ہے وہ بالاچ جیسے ایک قادرالکلام شاعر کا ہی حصہ ہے، کہتا ہے:-

دودا تئی کوری کشگ

ایر مالگ ودستی مشگ!

من ءَ منڈ ءَ پراموش نہ بیت

دردے مں بالاچ ءِ دل ءَ

چڑاں و کایان چہ درءَ

بچّان ءَ گندان بے پت ءَ

داب کپنگنت روچ ءِ سرءَ

دردے مں بالاچ ءِ دل ءَ

یوران ءَ گندان لنگڑءَ
آہنیگ ءَ روچ ءِ سرءَ
دردے من بالاچ ءِ دل ءَ

○

جوانین جن ءَ موتکھاڑوءَ
حلق بیت ڈیلش ملگی
حلق بیت وموی ءَ رچیت
من زرنگین پیراہن ءَ
دردے من بالاچ ءِ دل ءَ

○

یعنی:-

دردا اندھوں کی طرح تیرا مارا جانا
زمین پر تیرا گرنا اور کفِ افسوس ملنا
مجھے کبھی فراموش نہیں ہوگا۔
بالاچ کے دل میں ایک دردا ٹھتا ہے۔

○

باہر سے گھوم پھر کر جب میں آتا ہوں
تیرے یتیم بیٹوں کو دیکھتا ہوں،
جو دھوپ میں پڑے سوتے ہیں۔
بالاچ کے دل میں ایک دردا ٹھتا ہے

○

جب میں تیرے گھوڑوں کو دیکھتا ہوں
کہ دھوپ میں بھوکے بندھے رہتے ہیں
بالاچ کے دل میں ایک درد اٹھتا ہے۔

○

جب میں تیری اچھی بیوی کو
غمگین دیکھتا ہوں
اور یہ دیکھتا ہوں کہ اس کی قامت زیبا
موم کی طرح پگھل کر
اس کی نرم قمیص میں گرتی رہتی ہے
بالاچ کے دل میں ایک درد اٹھتا ہے

○

بالاچ میں قنوطیت نہیں ہے اس میں رنج والم اور دکھ درد برداشت کرنے کی سکت اور ہر ظلم سے ٹکرانے کی ہمت اور حوصلہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ دودا کے غم میں اس کا دل خون کے آنسو ضرور روتا ہے لیکن کمزوری نہیں دکھاتا، اسی نظم میں جس کے چند اشعار اُوپر آچکے ہیں۔ دودا کی بیوی بچوں پر نوحہ خوانی کرنے کے بعد بلوچوں سے مخاطب ہوکر بالاچ کہتا ہے:۔

من گوں بدان چون ءَ کنان
گون دودا ءِ جورین دشمنان
من گوں بداں ہمچش کنان
کہ میدان گوں ماہی ءَ کتہ

بزگوں کھیری ڈنگران
بازگوں کپوت ءِ دلران
گربین بوار گون چلران
من گوں بدان ھمچش کنان
دودار جورین دشمنان
میردانگیں مردان کشان

یعنی:۔
تم جانتے ہو کہ میں دشمنوں کے ساتھ
دودا کے قاتلوں کے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟
میں دشمنوں کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو:۔
مچھیرے، مچھلی کے ساتھ
بکری کھبیر کی ٹہنیوں کے ساتھ
باز کبوتروں کے جھنڈ کے ساتھ
اور گرم لُو
پانی کے پتلی تہ والے جوہڑ کے ساتھ کرتی ہے۔
میں دشمنوں کے ساتھ
دودا کے زہریلے قاتلوں کے ساتھ بھی
ایسا ہی سلوک کروں گا،
اُن کے نامور افراد کو مار ڈالوں گا،

بالاچ صرف گفتار کا غازی نہ تھا بلکہ کردار کا پیکر بھی تھا۔ اپنے
بھائی کے انتقام میں بلیدیوں سے اُس نے جتنے آدمی مارے اپنی ایک

رزمیہ نظم میں ان کی تعداد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

من پہ سُہر نگیں دوداءَ!
آسے من لدان مان داشتہ
نکھشے من جہان ءَ اشتہ
شست و شش بلوچوں گُشتہ
بیدچہ ٹامراں سیاھیناں
بیدچہ کار سرانی جبستان
بیدچہ لیٹروان زونگیناں
بیدچہ سُرو مگین گاڈمیشان

یعنی :- میں نے اُس سرخ رنگت والے دودا کے لئے
جنگلوں میں آگ لگا دی۔
دُنیا میں اپنا ایک نشان چھوڑا۔
چھیاسٹھ بلوچ میں نے مار ڈالے،
بغیر اُن کالے غلاموں کے
بغیر ان بیلوں کی جوڑیوں کے
جو ہلوں میں جتے ہوئے ہوتے تھے
بغیر ان موٹے تازے نر اونٹوں کے
اور بغیر ان کالی بھینسوں کے
جو میں وقتاً فوقتاً مار ڈالتا رہا۔

ایک دفعہ بالاچ کو اس کے دشمن بلیدیوں نے طعنہ دیا کہ تم رات کو

چوروں کی طرح چھپ کر لڑنے کو آتے ہو، یہ مردوں کا شیوہ نہیں، اگر ہے تو اطلاع دے کر میدان میں آجاؤ تب تمھاری بہادری کا پتہ لگ جائے گا، بی بحر بلیدی جس نے بالاچ کو یہ پیغام بھیجا کہتا ہے:۔

بالاچ !
چڑے چو دُزّیں تو لگان
داب ءَ کشے بزا ہندگان
معلوم بکن، بیا پہ مڑءَ
ورناشر کھلاں درکپنت
سرین بستگ وجاڑگگءَ
نےءَ کہ ترا گُلش جننت
من دھکہ و مٹہت منان

بالاچ ! یعنی:۔
تم تو گیدڑوں کی طرح چھپ کر بھرتے ہو۔
اور نیند میں ہمارے بھائیوں کو مار ڈالتے ہو۔
اگر تم میں مردانگی ہے تو
اطلاع دے کر لڑنے کو آجاؤ
تاکہ نوجوان کمر کس اور مسلح ہو کر
اپنے گھروں سے باہر آجائیں۔
یہ خیال مت کرو کہ
وہ سب تجھ پر ایک ساتھ حملہ کریں گے

نہیں!
تیرے مقابلے پر میں اکیلا آؤں گا،
میں ہی تیری ٹکر اور برابر کا ہوں،

بلوچ کے لئے دشمن سے طعنہ سننا ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ یہ ن نہ تھا کہ بالاچ پر بی بجر بلیدی کے طعنے اثر نہ کرتے اور بی بکر بھی ہی چاہتا تھا کہ بالاچ اس کے طعنے سن کر گھمنڈ میں آئے اور اُسے کھلے یدان میں مبارزت کی دعوت دیجائے مگر بالاچ سمجھدار تھا، اُس نے بجر کے طعنے کا وہ اثر نہیں لیا، جو بی بجر چاہتا تھا، بالاچ اپنے متعلق سی غلط فہمی کا شکار نہ تھا، اسے اپنی طاقت، بہادری اور دشمن کی کثرت اور بالادستی کا پورا اندازہ تھا، بی بجر بلیدی کے جواب میں اُس نے جو کچھ کہا ہے اس سے اس کی معاملہ فہمی اور باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے، کہتا ہے:۔

بی بجر! ترا ہوش من سرنت
من جنگے نہ داتان تو لگی
شیری ءُ بورنیتان یدی
نے ءُ بور بستان دہ صدی
نہ لشکرے سیاہ و بزین
من پہ وتی ھیسی سرءَ
ہر شپ چو بشامی درھدءَ
بندان و کایان پہ مڑءَ

یعنی:- بی بحر! کیا تیرے ہوش و حواس بجا ہیں
میں گیدڑ کی طرح نہیں لڑتا،
بلکہ شیر کی طرح دشمنوں کو توڑ دیتا ہوں۔
میرے پاس نہ تو ہزاری گھوڑے ہیں۔
اور نہ ہی کوئی بڑا لشکر ہے۔
میں صرف اپنے ہی اکیلے سر
ہر رات کو ساون کے تیز برسنے والے بادلوں کی
امنڈ کر لڑنے کو آتا ہوں۔

بالاچ اپنی رزمیہ نظموں میں صرف دشمن کی کمزوریوں خود
دسراس اور مصائب کا بیان نہیں کرتا، بلکہ خود اس پر جو مصیبتیں گز
ہیں اور اُسے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کا بھی بیان کرتا
دن رات پہاڑوں میں گھومتے پھرتے، توشے کا جو تھیلا اور پانی کا
اُس کی پیٹھ پر لدا ہوا ہوتا ہے، اس کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

شاکہ منی بیرگوں دشمنان گارنت
کمبریں گونچاں من سرگ بارنت
توبہ چہ گونچان ءَ درد گینان
گوبگاں سیاہماری عبنت کادان
چہ زہانی جوشند گیں آپان!
صیدش پہ ناکام ءَ گرنت تنگان

یعنی:- جب کہ دشمن پر میرا خون کا

کی ایک تصویر اُبھر آتی ہے کہتا ہے

پاد کت منءَ جگّانی نقیبوءَ ؛
بست اٹّے بالاچ کہ آستہ بامءَ
ہتنگ ءِ بنگ چہ گیگ ءَ گپتنت
اَرگین ذال چہ مرمرین آسءَ

یعنی :- نقیبو نے مجھے جگا کر کہا
اُٹھ اے بالاچ کہ صبح کی روشنی پھیل گئی ہے
گاؤں کے کتے خاموش ہو گئے ہیں۔
بوڑھی عورتوں کی ٹمٹماتی ہوئی آگ بھی بجھ گئی ہے

اپنے پہاڑ سے اترنے اور بی بگر کے گاؤں تک راتوں رات پہنچنے کی تفصیلات کو ایک دلکش پیرایے میں بیان کرنے کے بعد بالاچ کہتا ہے کہ خیمے میں داخل ہو کر میں نے دیکھا کہ بی بگر چارپائی پر اپنی بیوی کی بغل میں سویا ہوا ہے۔ تب میں نے :-

دستوں بر آشلیں خنجرءَ برتان !
کارنہ رانت شلین خنجرو ہوتءِ
دستوں برت پولاتیں تبرزیں ءَ
کارنہ انت پولاتین تبرزین ءَ
دستوں بر آموتیں کیںگ ءَ برتان
چہ سیوائی تیراں درچتاں یکے
سر بماسوہان ءَ لبینگار تان

برز ہما چوَ زوار ءِ دپ ءَ داتان
زوروں ہمارا ستیں ہنچگ ءَ داتان
درھلگ ءَ سیوائیَ کمان رفتین
سر برءِ لیپ گوں منجوءَ شپتین
چیر ہماسچکانی تگرد گپتین
حونی چرءَ پتّانی دپ ءَ کہتکنت
چہءَ بروتان درَ برِنگتین ریشان
چیر جتاں دست ءَ گپتگاں تنگے

میں نے اپنے نوکدار خنجر پر ہاتھ ڈالا
نہیں! نوکدار خنجر اس بہادر پر کارگر نہیں ہوگا۔
پھر میں نے اپنی فولادی کلہاڑی سنبھالی۔
نہیں؛ فولادی کلہاڑی کا بھی یہاں کام نہیں۔
اب میں نے اپنے کالے کیسے میں ہاتھ ڈالا
اور سیوا کے خدنگوں میں سے ایک چن لیا
جس کی نوک کو سوہان سے رگڑ کر تیز کیا گیا تھا۔
اسے میں نے تیر پر چڑھایا۔
اور اپنے دائیں پنجے پر زور دیکر (کمان کو کھینچا)
ایک دھماکے سے سیوائی کمان چھوٹی
اوپر کی رضائی کو چارپائی کے ساتھ سی کر
نیچے کی خوبصورت چٹائی سے جاکر تیر پیوست ہوا

خون اس کے ہونٹوں سے
مونچھوں اور گھنی ڈاڑھی پر سے بہنے لگا
میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا
اور چلو بھر کر اس کا خون ایک گھونٹ پی لیا

جس دن بی بکر بلیدی نے بالاچ کے بھائی دودا گورگیج
اُس دن بلیدیوں کی اپنی عورتیں خوفزدہ اور پریشان ہوئیں
کہ اب گورگیجوں اور بلیدیوں کے درمیان لڑائی ہوگی. کشت
بازار گرم ہوگا، اور کئی نوجوان بلوچ بے گناہ مارے جائیں گے
اپنی رزمیہ نظم میں بلیدی عورتوں کی اس خوفزدگی اور پریشانی
کرتا ہے. ایسے موقعوں پر عورتیں جسطرح سوچتی ہیں وہ بالاچ
صاحب ہوش و فراست شاعر کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں
پر دیکھا جائے تو قبیلہ کی عورتوں کو دشمن کے مارے جانے پر خوش ہو
کہ اُن کے جوانمردوں نے ایک دشمن کو تہِ تیغ کیا۔

ممکن ہے کہ ایک کم فہم شاعر اس واقعہ کو بیان کرتے وقت
عورتوں کو خوشی کے شادیانے بجاتے ہوئے دکھاتا مگر، بالاچ جو ایک
کار شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بلوچوں کا رمز شناس بھی تھا، اور بلوچ
کا دلدادہ بھی۔ شاعروں کی عام روش کی پیروی نہیں کرتا، بلکہ بلید
عورتوں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے
ہے بلیدی عورتیں لرزہ براندام ہوئی تھیں، بالاچ بلیدی عورتوں
دل کی بات کرتا ہے۔ اور یہی اس کی اثر انگیزی کا راز ہے۔ یہی وجہ

ج بھی بالاچ کے یہ رزمیہ اشعار ایک منتقم بلوچ کا دل اسی طرح گرماتے ۔تے ہیں متاثر کرتے ہیں جس طرح آج سے سینکڑوں برس پہلے کیا کرتے تھے۔

بلوچی کی رزمیہ شاعری اگر سینکڑوں برس کے بعد بھی اب تک تازہ بہ ہ معلوم ہوتی ہے تو اس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ بلوچ شعراء نے دور کار، بلند پروازی، بلوچ معاشرہ سے بعید تشبیہات و استعارات عمال نہیں کئے ہیں بلکہ زیادہ سلیس اور سادہ زبان میں عام فہم بات کی۔ ہے ۔لئے ان کے اشعار بلوچوں کے عوام و خواص پر یکساں اثر کرتے ہیں سرے لفظوں میں اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ شاعر نے غم جانان غم دوران کو سمیٹ لیا ہوتا ہے۔ بہرحال بلیدی عورتوں کی کیفیت بیان ۔ ہوئے بالاچ کہتا ہے:۔

کاڈاں پہ چمان دیستگنت
انزہی اش حونی گریتگنت
مردان پہ راھشیف گوئشگنت
شہ کہ ہہے مرد کشتگنت
زانان بلوچ بے داجگنت
آزر کہ بی یکر زر تگنت
پتا گرد کھیں نہ بنت
یزد خراسانی کماچ

نی:۔ خوبصورت عورتوں نے
جب خود اپنی آنکھوں سے (دودا کو قتل ہوتے ہوئے) دیکھا۔

تو خون کے آنسو روئیں۔
اور انہوں نے اپنے مردوں سے صاف صاف کہدیا
کہ تم لوگوں نے جو اس جوانمرد کو مار ڈالا ہے۔
کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ
یہ ایک لاوارث بلوچ ہے،
اور اس کا انتقام لینے والا کوئی نہیں!
اچھی طرح سے سمجھ لو کہ
اسے مار کر بی بکر نے جو دولت حاصل کی ہے
وہ ہمارے لئے دوپٹے اور شال نہیں ہوں گے
اور نہ ہی اُن سے ہمارے لئے
خراسان کے بنے ہوئے
ریشم اور مخمل کے کپڑے خریدے جاسکیں گے

بالاچ کی رزمیہ شاعری کو بلوچستان میں دوام حاصل ہوا
اس سرزمین پر جب تک ایک بلوچ بھی زندہ رہے گا اور اُس
رگوں میں بلوچ کے جذبۂ انتقام سے گرم خون گردش کرتا رہے گا
بالاچ اور اس کی رزمیہ نظمیں بلوچستان کے پہاڑوں اور وادیوں
گونجتی رہیں گی۔ بالاچ کی رزمیہ نظمیں بلوچی خو و خصلت کا ایک ا
آئینہ پیش کرتی ہیں، جس میں بلوچ کو نہ صرف اپنا ماضی نظر آتا
بلکہ اس میں اپنے حال و مستقبل کو بھی عیاں دیکھتا ہے، ایک بلو
شاعر نے بالاچ کے ان ہی قومی جذبات سے بھرپور رزمیہ نظموں
متاثر ہو کر کہا ہے:-

بالاچ ءَ حلال باتاں پہر
جورین دشمنان باتان زہر
ہرروچ ءَ کنئے راج ءَ قہر
مات پہ پسگاں حیران تنت
گہار پہ چوٹ بروتین براتان
وَتیگ پہ دَتی زاماتان
کاڈ پہ سمترئین قولیگان

یعنی:- بالاچ!
غرور صرف تجھے ہی زیب دیتا ہے۔
تیرے دشمنوں کو نہیں۔
اُن کے لئے تو زہرِ قاتل ہے۔
تم ہر روز
اپنے دشمنوں پر ایسا قہر ڈھاتے ہو کہ
مائیں اپنے بیٹوں کے لئے پریشاں ہیں۔
بہنیں اپنے کھڑی مونچھوں والے بھائیوں کے لئے
ساس، اپنے دامادوں کے لئے۔
اور بیویاں اپنے پیارے خاوندوں کے لئے
حیران وپریشان رہتی ہیں۔

تیسرا باب

دوسرا دور ۔ (متوسّطین)

بلوچی کی ادبی تاریخ کا یہ دَور جسے ہم شعرائے متوسطین کا دور قرار دیتے ہیں، تقریباً ۱۵۵۰ء سے ۱۸۳۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں بلوچی شاعری نے جو نقوش چھوڑے ہیں اُن میں رزمیہ شاعری کے آثار کم اور بزمیہ شاعری یعنی حسن و عشق کی داستانیں زیادہ ملتی ہیں ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پندرھویں سولھویں صدیوں کی رزم آرائیوں نے بلوچوں کو جنگ و جدل سے کسی قدر بیزار کر دیا تھا، نوجوانوں کا بانکپن اب گذارۂ معاش کی الجھنوں میں پھنس کر ماند پڑ چکا تھا، عوام الناس میدانِ جنگ میں تلواروں کی جھنکار سننے کی بجائے شبینہ محفلوں میں نَے سرود اور تھنبورہ کے نغمے سننا زیادہ پسند کرتے تھے، رزمیہ شاعری کی للکار پر بزمیہ شاعری کی رنگین بیانی اور گویّوں کی شیریں نوائی کو ترجیح دیتے تھے،

شاعر، جسے وقت کا پیغامبر کہا جاتا ہے اور وقت کی نبض پر جس کا ہاتھ ہوتا ہے، بلوچوں کی اس ذہنی تبدیلی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا، اس تناسب سے اس نے بھی اپنی لے بدل دی، اب اس کے کلام میں شمشیر و سنان کے بجائے طاؤس و رباب کی رنگینیاں در آنے لگی تھیں، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہمیں رزمیہ نظمیں

بہت کم ملتی ہیں۔ اُن میں وہ تاثر، بُزندگی اور گیرائی نہیں ہوتی جو دورِ متقدمین کے شعرا کی رزمیہ نظموں میں پائی جاتی ہے۔

جام دُرک اِس دور کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قلات کے خان، نصیر خان نوری کے دربار کے ملک الشعرا تھے۔ جام درک نے بلوچی شاعری کو بیانیہ کی سہل انگاریوں سے نکال کر تخئیلاتی بلند پروازیوں تک پہنچا دیا، اگرچہ بلوچی شاعری سے متعلق کسی بلوچ دانشور کا یہ قول مشہور ہے کہ

شاعری ءِ آس ءَ شے کلاں بالتگ
شے عیلے دست تاپتگ
جام دُرک پھراں آپتہ کتگ

یعنی:- (بلوچی) شاعری کی آگ شے کلان نے جلائی۔
شے عیلے نے (اُس کے انگاروں پر)
ہاتھ تاپے۔
اور جام درک نے خاکستر پھونکی

لیکن ہماری رائے میں جام درک کا مقام شاعری میں سب سے بلند ہے اُس نے بلوچی شاعری کو اُن رموز سے آشنا کیا ہے جن سے ماقبل کی بلوچی شاعری واقف نہ تھی، اور اُن زاویوں سے گنجینۂ شعر کو سمیٹا ہے جن کی تہ تک پہنچنا اب تک بلوچی شعراء کی دسترس سے باہر ہے۔

جام درک کی شاعری زیادہ تر عشقیہ ہے، البتہ اس میں کسی قدر

غالباً اس دور کا اثر ہے یہ پائی جاتی بھی آمیزی رنگ کی تصوف
ہے جس میں خان نصیر خان نوری اور احمد شاہ ابدالی مذہبی غزوات
کے نام سے ہندوستان کی سرحدات پر حملے کیا کرتے تھے اس کے
باوجود جام درک نے ان بادشاہوں کی رزم جوئی کے قصیدے نہیں لکھے
اور نہ ہی رزمیہ داستانیں نظم کی ہیں۔ البتہ اس کی صرف ایک نظم ایسی
ملتی ہے جس میں اس نے احمد شاہ ابدالی اور نصیر خان نوری کے درمیان
لڑائی کا واقعہ بیان کیا ہے لیکن اس نظم کے کہنے پر بھی اُسے رزم آرائی
کے جذبے نے نہیں بلکہ بلوچیت کی پاسداری نے ابھارا ہے یا پھر اپنے
ولی نعمت کی خوشنودی طبع اس کے پیش نظر رہی ہے۔

جام درک کی یہ نظم اور وہ دوسری تمام رزمیہ نظمیں جو اس دور میں کہی
گئی ہیں، اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ بلوچی شاعری کی وہ پرانی روش
جس پر ہم متقدمین کی رزمیہ شاعری کے بیان میں روشنی ڈال چکے ہیں کسی
حد تک ترک کردی گئی تھی جیسا کہ ان نظموں کے ابتدائیہ اشعار سے ظاہر ہوتا
ہے اب فخریہ جذبات کے اظہار قبائلی عصبیت اور ملی مدح و ستائش
کے بجائے نظم کی ابتدا مذہبی حمد و ثنا اور نعت گوئی سے ہوتی رہی ہے
مثال کے طور پر جام درک اپنی اسی نظم کی ابتدا اس طرح کرتا ہے:-

خدایا! گند من ءَ پاکین نگاہان
تئی مہرانِ طلب جوانت منی جان
سوآئیں منصبان کن شاہِ مردان
سروں ڈکھیا مکن، ڈیلوں ہوندان
رگھامے ساڈری آنکہ پہ مردان

شتہ درو گھین دنیائی دیتہ گردان
حدیثان ءَ گوتشی دُرّی دُر کیان
گوتشی دُرّی دگِندی ملکا بان
بشارت داتگنت واجہ کلایان
دلوں آ دڑی دنت مثلِ دریایان

یعنی ا- خدایا مجھ پر اپنے کرم کی نظر کر
میں تیری رحمتوں کا طلبگار ہوں۔
یا شاہ مردان مجھے سرفراز کر،
مجھے تکالیف سے بچائے رکھ
اور تندرستی دے
ساون کی گھٹاؤں کی طرح
مردوں پر مصائب اُمنڈ آئے ہیں۔
یہ جھوٹی دنیا گردش میں آئی ہے
دُرّی دُرّک، شاعر جو تاج شاہی کا موتی ہے
ان مصیبتوں کا بیان کرتا ہے
دُرّی جو کچھ کہہ رہا ہے
ملائکہ اُسے دیکھ رہے ہیں۔
واجہ کلائی درویشوں نے[1]
مجھے بشارت دی ہے اس لئے

[1] درویشوں کا ایک مشہور بلوچ طائفہ ہے۔

اشعار یہ ہے ذیل ہیں

اَمواج دریا کی طرح اُمڈ کر آتے ہیں۔

اس دور کی دوسری رزمیہ نظم جو دستیاب ہوئی ہے وہ دینار گچکی اور نادر شاہ ایرانی کی لڑائی سے متعلق ہے۔ نظم کی ابتدا ملاحظہ ہو:۔

فرقان و براق ، راہدر بر
دُراہ بی ، عادلیں شیر نر
دینار گوں براق و زھمبر

یعنی :۔ الٰہی! قرآن و براق اور
راستہ دکھلانے والے پیشوا کے طفیل
اس عادل اور شیر نر جیسے بہادر دینار کو
اس کے گھوڑے اور کاٹنے والی تلوار کے ساتھ
سلامت رکھ۔

تیسری نظم جو حمل جئیند اور پرتگیزوں کے درمیان اس لڑائی سے متعلق ہے جس میں حمل جئیند شکست کھا کر پرتگیزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوتا ہے یہ نظم اس دور (۱۵۰۰ء سے ۱۵۹۵ء تک) کی ہے جب پرتگیزی بحری قزاق بحر ہند میں ڈاکے ڈالا کرتے تھے، خلیج فارس میں ساحل بلوچستان کی بندرگاہیں ان کی دسبرد سے محفوظ نہ تھیں، بندرِ عباس چاہ بہار، جیونی گوادر، پسنی اور سون میانی کی بندرگاہیں متعدد بار ان کی لوٹ مار کی آماجگاہ بنی رہیں۔

حمل جئیند جو کلمتی ہوت بلوچوں کا سردار تھا پرتگیزی قزاقوں
کے مقابلے کو نکلا۔ متعدد بار بحری لڑائیوں میں انہیں مار بھگایا لیکن
یک دفعہ جبکہ وہ بحری سفر پر جا رہا تھا، پرتگیزی قزاقوں نے سمندر میں
اسے اچانک گھیر لیا، ایک خونیں مقابلہ کے بعد میر حمل کو گرفتار کر لیا گیا
پرتگیزوں کے ساتھ اس لڑائی سے متعلق جو نظم ملی ہے کہا جاتا ہے کہ
اس کی مصنفہ میر حمل کی بہن ہے۔ نظم کی ابتدا اس توہم کے ذکر سے کی
گئی ہے جس میں اب تک بلوچ کسی قدر مبتلا ہیں۔ خطاب بلوچ خواتین
سے ہے، کہتی ہے:-

شنبہ و شانزدہ سر مشود براتانی گہار
شنبہ پہ براتان شر نہ انت، شانزدہ پہ پت ءَ
شنبہ ءِ روچ و شانزدہ ءِ شومیں ساعت ءَ
حمل ءَ شاگے نول کت و شومین عقرب ءَ

یعنی:-

اے بھائیوں کی بہن!
ہفتے کے دن اور سولہویں تاریخ کو
اپنا سر نہ دھونا۔
کیونکہ ہفتے کا دن بھائیوں کے لئے
اور (چاند کی) سولہویں تاریخ باپ کے لئے
سعید گھڑی نہیں ہے
ہفتے کے دن
اور سولھویں کی منحوس تاریخ کو

حمل نے اپنی کشتی سمندر میں ڈال دی
اور وہ کتنا منحوس دن ثابت ہوا

حمل جیئند کی یہ نظم جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اگرچہ بلوچی کی رزمیہ بحر میں نہیں لیکن موضوع اور طرزِ بیان کے پیشِ نظر اسے رزمیہ نظموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ جس بحر میں یہ نظم کہی گئی ہے وہ "ھلوھالو" کی بحر ہے اس بحر میں عموماً ایسی نظمیں کہی جاتی ہیں، جو شادی بیاہ اور خوشیوں کی تقریب مناتے وقت عورتیں گاتی ہیں اس لئے ہم اسے زنانہ طرز بھی کہہ سکتے ہیں۔

دورِ متوسطین کے شعرا کی زبان اگرچہ صاف، سلیس اور روان ہے لیکن اس میں کہیں کہیں عربی اور فارسی کی آمیزش بھی ملتی ہے۔ اندازِ بیان میں بلوچیت کی وہ کڑک، مدھم پڑ گئی ہے۔ جو دور متقدمین کے شعرا کی زبان میں پائی جاتی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس دور میں فارسی بلوچستان میں خط و کتابت اور تعلیم کی زبان بن چکی تھی۔

حمل جیئند کا واقعہ غالبًا سولھویں صدی کے نصف آخر کا ہے جب دمن، دیو اور کوچین وغیرہ ہندوستان کے ساحلی مقامات پر قبضہ جمانے کے بعد پرتگیزی بحری قزاق خلیج فارس میں لوٹ مار کیا کرتے تھے بلوچ پرتگیزیوں کو پرنگستان (فرنگستان) اور ان تمام سفید چمڑی والوں کو جو وہاں سے آئے پرنگی یا پلنگی کہتے تھے۔ اس لئے نظم میں پرتگیزی کی تخصیص نہیں ہے بلکہ انہیں پرنگ (فرنگ) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ نظم بہت مشہور ہے اور تمام بلوچستان میں حملِ جیئند سے اظہارِ عقیدت کے طور پر گائی جاتی ہے۔

حمل جیئند کی یہ نظم، دوسری بلوچی رزمیہ نظموں سے صرف اس لئے ممتاز نہیں کہ ہلوہالو کے بحر میں ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ ایک بلوچ

ی (خاتون) کی تصنیف ہے اور اس میں قوم و وطن سے محبت کا بھرپور
ہار، بلوچ معاشرہ کی برتری اور ملی عصبیت کی واضح نشاندہی کی گئی ہے
ل کے طور پر پرتگیز جب میر حمل کو گرفتار کر کے بقولِ شاعرہ اپنے وطن لے
تے ہیں. تو اس کی جوانمردی اور سرفروشی سے متاثر ہو کر اس سے درخواست
رتے ہیں کہ ان کی کسی لڑکی کو پسند کر کے اس سے شادی کرے اور وہاں
ں جائے لیکن میر حمل ان کی درخواست کو اس لئے ٹھکراتا ہے کہ اُن کی
ورتیں اس کے بلوچی معیار پر پوری نہیں اترتیں. کہتا ہے.

پَشکِش گوَنڈَنت و ناپگانی کھنڈِش درَنت
جن جھوُدُ ئَنت و مردش بے دِنیں کافرَنت
نئَ دیم شوذَنت و نے ہدا ئَ نام ءُ گرَنت
چکش من کُٹ ءَ نَنت گوَ تُشے ہیکی گلاءَ نت
نائی چانکاں گوں مکہکاں ہور ورَنت
مرد ئیکاران ئَنت جن شپانکاں گوں دست و گورَنت
دوستی اِش است گوں لوگی پونچوئیں بزدلان

یعنی:- مجھے اُن کی عورتیں اس لئے پسند نہیں کہ:
اُن کی قمیصیں اتنی چھوٹی ہیں کہ
اُن کی ناف نظر آتی ہے۔
اُن کی عورتیں یہودنیں،
اور مرد بے دین کافر ہیں،
نہ ہاتھ اور منہ دھوتی ہیں۔

اور نہ ہی خدا کا نام لیتی ہیں
گود میں ان کے بچے ایسے لگتے ہیں
جیسے سُور کے پلّے ہوں
کھجور کا حلوا بناتے ہیں تو،
اس میں مکھیاں ملاکر کھاتے ہیں۔
— جب مرد شکار کو جاتے ہیں تو،
اُن کی بیویاں چرواہوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا
یا پھر گھر میں پڑے ہوئے
ناکارہ بزدلوں سے پیار کرتی ہیں۔

اس موقع پر بلوچ خواتین سے ان کا مقابلہ کرنا قدرتی بات
شاعر کو اس کا خیال ہے، اس لیئے میر حمل کی زبان بن کر کہتی ہے:۔

من ءَ وتی ملک ءِ کاڈ خمار چمّیں دوست بنت
پشک و شلوار و سریگ شاریں چادر تنت
آستینکش دراج تنت لنکانی بوگش درتنت

یعنی:۔

مجھے اپنے ملک (بلوچستان) کی
نشیلی آنکھوں والی بیبیاں پیاری لگتی ہیں۔
جن کی قمیص، شلوار اور دوپٹے
ریشمی کپڑوں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں
اُن کی قمیصوں کی آستینیں اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ
فقط ان کی انگلیاں نظر آتی ہیں۔

نظم میں پرتگیزوں کے ساتھ میر حمل کی لڑائی کا نقشہ جس خوبصورتی سے کھینچا گیا ہے اس میں جدت بھی ہے اور رنگین بیانی بھی جرأت مندانہ للکار بھی ہے اور مستاسغانہ اظہار بھی، تلواروں کی جھنکار بھی ہے اور کمزور دلوں کی فریاد بھی، غرضیکہ نظم ہر لحاظ سے ایک شعلہ بیان شاعرہ کے پُر درد دِل کی ترجمان اور وطن دوست اور سرفروش بلوچ کی کامیاب رزمیہ داستان ہے۔ انداز بیان میں وہ شگفتگی اور اثر انگیزی ہے کہ نظم سننے کے بعد سامعین پر ایک گونہ بے خودی سی چھا جاتی ہے۔ میر حمل کے سفر پر روانگی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے یوں کہتی ہے:۔

هفت شپ ءِ هفت روچ شاگ پما ایک گوش ءَ شتہ
هشتمی روچ ءَ آرتش گوں جوریں دشمناں
چار گھراب تنت گوں مرگھی چڑوکیں بانزلان
حمل ءِ شاگش چپّ و چو گرد ءَ گیتگنت
توارش پر کرت کہ حمل! ترا دسگیر کنوں

یعنی:۔ سات راتیں اور سات دن
اسی ایک سمت میں کشتی تیرتی چلی گئی۔
آٹھویں دن دشمنوں سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔
دشمن کی چار کشتیاں۔
اڑنے والے پرندوں کی طرح پر پھیلائے
انہیں نظر آئیں۔

چاروں طرف سے حمل کی کشتی کو
انہوں نے گھیر لیا اور وہ للکارے
حمل! ہم تجھے گرفتار کرلیں گے

میر حمل پرتگیزوں سے گھبرانے والا شخص نہ تھا۔ خلیج کی پہنائیوں
متعدد بار وہ ان سے دو دو ہاتھ کرچکا تھا اور بارہا ان کو مغلوب کرکے
ہتھیار اور لوٹ کا مال اُن سے چھین لیا تھا، مگر آج حمل اکیلا تھا ا
جنگی بیڑہ ساتھ نہیں تھا، صرف دس بیس مچھیروں (میدِ) کے ساتھ اس
یہ سفر اختیار کیا تھا، کیونکہ کچھ عرصہ قبل اس نے پرتگیزوں کے ساتھ ای
دوستانہ معاہدہ کیا تھا، جس میں پرتگیزوں نے بلوچستان کے سا
لوٹ مار نہ کرنے کا اُسے یقین دلایا تھا، اور میر حمل نے بھی خلیج میں
دوسری سرگرمیوں سے تعرض نہ کرنے کا اقرار کیا تھا، میر حمل کو یہ گمان
تھا کہ وعدہ مواعید کے باوجود پرتگیزی قزاق اُس کے ساتھ دھوکہ کر
اس غلط فہمی میں اپنے بلوچی بیڑے کو گوادر اور سون میانی کی بندر
میں چھوڑ کر خود ایک تجارتی جہاز لے کر سمندر میں نکل آیا تھا، بہرحال
میر حمل نے دیکھا کہ دشمن کے جہازوں نے اسے گھیر لیا ہے تو

حمل وتی شاگ ءَ گوئر دلیں بیلاں شہکارِتگ
حمل ءَ ہمراہ بے دلیں دشتی بلتگنت
جانش جوگڑیں اشکر ءِ بے براز بتگنت
آدِگہ میدان لگی تدبیر گرتگنت
سیاہرو دسیاہیں میدرزءَ گپ ءَ کپتگنت
من دپ وریشاں ساوڑءَ موجاں گپتگنت

حمل نے اب اپنی کشتی کے ساتھیوں کو آواز دی
حمل کے ساتھی بزدل دشتی تھے،
اُن کی جان، گزؔ کے انگاروں کی طرح بُجھ گئی
اور وہ دوسرے جو مچھیرے تھے،
انہوں نے بھاگنے کا ارادہ کیا،
اور پھر ان کالے مچھیروں نے اپنا منہ کالا کر کے
سمندر میں چھلانگ لگا دی۔
اُن کے کالے چہرے اور ڈاڑھیاں
سمندر کی موجوں کی نذر ہوئیں۔

یہاں پر ایک چیز قابل غور ہے کہ شاعرہ نے دشتیوں کی بُزدلی کو گز ے انگارے سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ ایک نہایت موزون اور نادر تشبیہہ ہے۔ چستان میں گز کے درخت عام ملتے ہیں جن کی لکڑی جھگیوں کی تعمیر ں کام آتی ہے اور جلانے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے۔ گز کی لکڑی ے انگاروں میں تپش نہیں ہوتی، جلتے ہی راکھ بن جاتے ہیں اس تشبیہہ ے شعر اس قدر موثر اور عام فہم بن چکا ہے کہ سادہ سے سادہ بلوچ بھی ں کیفیت کا ادراک کر سکتا ہے جو اس وقت ان دشتیوں پر گذری جو کشتی ں میر حمل کے ساتھ تھے،

اس نظم میں شاعرہ نے مضمون کو جس طرح سے سمویا اور بیان کیا ہے ں سے اس کی قادر الکلامی اور رمز شناسی کے علاوہ بلوچی کی فصاحت بھی بطریقۂ احسن اظہار ہوتا ہے حمل کی وہ تمام خصوصیات ایک ایک ر کے سامنے آتی ہیں، جن کی وجہ سے بلوچوں میں اسے اتنی شہرت اور

...وری حاصل رہی ہے۔ بہادری، قوم پروری، وطن دوستی...
نظم کے ہر ایک شعر سے نمایاں ہوتی اور اپنا اثر دکھلاتی رہتی ہے...
اپنے ساتھیوں کی بزدلی اور فرار سے بے حوصلہ نہیں ہوتا، ...
کے مقابلے سے جی نہیں چراتا، بلکہ مردانہ وار ان کے مقابلے میں ڈ...
ہے۔ لڑائی میں اچانک اس کی تلوار ٹوٹ جاتی ہے۔ ملاحظہ...
کی اس وقت کی دلی کیفیت کو شاعرہ کیسی تمکنت سے بیان کر...

حمّل ءَ گوانک پہ پنجگ ءِ زرمشت ءَ جنگ
تیگھ صفاہانی! من ترا بچّی بیا تگ ودّرین دتگ
ہوَرانی وھدءَ گجریں بو پانی تل ءَ
نمبانی وھدءَ من قباہان ابریشمین
تو روک نہ بیتے من کافرءِ گوریں گردن ءَ
اَچ منی شیری پنجگ ءَ پرچے درشتے

یعنی:۔
حمّل نے اپنی تلوار کی طلائی مُشت سے مخاطب ہو...
اے میری اصفہانی تلوار!
میں نے اپنے بیٹے کی طرح تجھ سے پیار کیا،
بیٹے کی طرح پیار اور موتی جیسی بیٹی کی طرح
تجھے سنبھال کر رکھا،
برسات کے دنوں میں
میں نے تجھے نرم گدیلوں میں چھپایا۔

اور کُہر آلود فضا سے
اپنی ریشمی قبا میں چھپا کر تجھے بچاتا رہا
لیکن آج تُو نے مجھ سے بے وفائی کی
دشمن کی موٹی گردن پر اپنی کاٹ نہیں دکھلائی
اور میرے شیر جیسے پنجے سے
ٹوٹ کر تو کیوں دور جا گری؟

میر حمل کو تلوار کے ٹوٹ کر گرنے کا غم تھا، لیکن اتنا نہیں کہ اُس سے وہ بددِل ہو جاتا، اس کی فولادی کلہاڑی محفوظ تھی جس سے وہ دشمنوں کا مقابلہ کر سکتا تھا، لیکن لڑتے لڑتے وہ بھی سکّان میں لگ کر ٹوٹ گئی۔ میر حمل کو اس کا زیادہ صدمہ ہوا کہتا ہے:۔

زیادھگین تا وانے من ءَ سکان دا اتگنت
منی تبرزین چہ نقرہ ئین میخاں درشتگ
من زرءِ گبءَ کپتگ و بیت پشتی ٹنگ

یعنی:۔
زیادہ نقصان تو مجھے سکّان نے دیا
میری کلہاڑی اس میں لگ کر
چاندی کی میخوں سے نکل گئی۔
اور سمندر کی کف در دہن موجوں میں گر کر
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔

بالآخر ایک خونیں مقابلے کے بعد اب جبکہ میر حمل پوری طرح غیر مسلح ہو چکا تھا، بحری قزاقوں نے اُسے گرفتار کر لیا، پرتگیزیوں نے گرفتار کر کے اسکے

ساتھ جو سلوک کیا وہ ملاحظہ ہو:۔

دیر نہ بیتگ کہ حمل ءَ دسگیر کرتگنت
حمل ءِ دست گوں کمبریں ریزاں لبتگنت
کمبریں ریز و لیٹڑھی ہشت گردیں مہار
کمبریں ریزہ چو کمبریں ماراں وارتگنت
حونش شنزان تنت چہ بزرگیں موردانگان

یعنی:۔

دیر نہیں ہوئی کہ انہوں نے حمل کو گرفتار کرلیا۔
حمل کے ہاتھ دھاریدار رسوں
اور تر ادنٹوں کی آٹھ تاروں والی مہاروں سے
باندھ دیئے گئے
دھاریدار رستے دھاریدار سانپوں کی طرح
اس کے ہاتھوں کو کاٹتے رہے
اور اس کی پاک انگلیوں میں سے
رس رس کر خون بہنے لگا۔

بلوچوں کی روایت ہے کہ میر حمل کو گرفتار کرکے پرتگیزی قزاق اپنے وطن لے گئے۔ وطن سے مراد کونسا وطن ہے نظم کے ان اشعار کی طرف اشارہ ملتا ہے جن میں فرنگیوں کے لباس کا ذکر آیا ہے۔

ان کی قمیصیں اتنی چھوٹی ہیں کہ
کہ ان کی ناف نظر آتی ہیں۔

ایسا لباس ظاہر ہے کہ اس وقت کی یورپین عورتیں نہیں پہنتی تھیں،

لباس گوا، دمن، دیو اور کوچین کے باشندوں کا ہو سکتا ہے، اس سے ہم قیاس کرتے ہیں کہ میر حمل کو گرفتار کر کے پرتگیزی اپنی ان ہی نو آبادیوں میں سے کسی ایک مقام پر لے گئے ہوں گے، یہ بہر حال نظم کا وہ حصہ جس میں کہ میر حمل سمندری ہواؤں کے ذریعے سے وطن میں اپنے دوستوں، عزیزوں، اور پیاروں کو الوداعی پیغام بھیجتا ہے، بہت ہی پر سوز و یاس انگیز ہے اور ساتھ ہی بلوچ معاشرہ میں رہنے والے ایک جذباتی نوجوان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی وہ صدا بھی ہے جسے سن کر آج بھی ایک نوجوان دل تڑپ اٹھتا ہے۔ شاعرہ نے جس سلاست سے ان جذبات کو شعر کا جامہ پہنایا ہے وہ اس کی سخن سازی و خوش گفتاری میں کمال فن کا مظہر ہے، کہتی ہے:۔

کشتگین کو شان شمامتی حالان ءَ بربت
آلتن و شاہو و نوابو ءَ سر کنہت
نکّہ نیں ماس و منی گتریں بمبیگش دیہت
پتّنی مہانی گرانڈاں ایر جنگ مکن
پتّنی شام ءَ میلبیں گندیمان مُدّرشں
پتّنی پشت ءَ کھیس و بہیت زنگیں چادران
پتّنی بور ءَ بارگیں رو نبداں مَریس
حمّل ءَ پہران کپتگ و شومیں گھیتبان
حمّل ءَ پہرے پہ پت ءِ باری کتہ
حمّل ءَ پہراں کپتگ و دسگیر کرتگت

یعنی:۔

اے سمندر کی طرف سے چلنے والی ہواؤ
تم میرا حال لے جا کر
التن، شاہو اور نقیبو تک پہنچا دو،
میری والدہ محترمہ اور میری کمسن محبوبہ کو بھی
یہ جا کر کہہ دو کہ میری مہمانی کے لئے۔
مینڈھے کاٹنے کی اب فکر نہ کریں،
اور نہ ہی میری روٹی کے لئے
مہکدار گندم کا آٹا پییں،
میری اوڑھنی کے لئے۔
کھیس اور ہفت رنگی چادر نہ بُنیں
اور نہ ہی میری گھوڑی کے لئے
تیلی روبند بُنیں۔
کیونکہ حمل اب واپس پلٹ کر نہیں آسکے گا۔
حمل کو غیبت اور تکبر نے مارا ہے۔
حمل نے اپنے باپ کے زمانے میں ایک دفعہ تکبر کیا
حمل کو اس تکبر نے مارا
اور دشمنوں نے اسے گرفتار کیا

نظم میں بلوچیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ تشبیہہ و استعارے
استعمال کئے ہیں جو بلوچوں کے خانہ بدوشانہ معاشرہ کے مطابق ہیں اس
نظم میں چار چاند لگے ہیں۔ شاعرہ ایک مقام پر درحقیقت یہ کہنا چاہتی
کہ میر حمل کی گرفتاری اور موت سے تمام ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے

کی یتہ اسے وہ یوں بیان کرتی ہے:۔

سے وچار چیاں حمل ءِ کوش ءُ شادگتگ
حیداں مں جاہو، آسکاں مں شُوئیں رمبڑد
گریشگاں شیرو گور مں سیاہوشیں لداں
شابزاں گوتشتگ مل گوتا کوہی پاچیان!
بھلّہت مات کوہان بیارآن ریچپادان چرفن
حمّل جئیندمرتہ، نیں کئے جنت وکُشیت
کشتگش حمّل مں شکاراتی شادِھان!
مں لداں گورش کشتہ وشیر من گریشکان!

یعنی:۔ تین چار چیزیں حمّل کی موت سے خوش ہوئیں
جاہو کے پہاڑی دنبے اور بکرے
اور رمبڑو کے ہرن۔
جنگلوں میں شیراور سیاہی مائل صحراؤں میں گور
پہاڑی بکریوں نے بکروں سے مل کر کہا۔
چلو ریتیلی چراگاہوں میں جاکر چریں۔
حمل جئیند مر گیا ہے
اب وہاں ہمیں کون مارنے آئے گا۔
پہلے تو حمل شکار کے شوق میں
صحراؤں میں گور
اور جنگلوں میں شیروں کو مارا کرتا تھا،

شیر کے شکار کا ذکر آیا تو میر حمّل کی ایک اور نظم کی سماعت بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی، یہ بھی میر حمل جئیند کی ایک مشہور نظم ہے جو رزمیہ بحر میں کہی گئی ہے۔ انداز بیان واحد متکلم کا ہے جس سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ نظم کا مصنّف حمل جئیند خود ہے اس سلیس نظم میں حمّل نے شیر کے ساتھ اپنی لڑائی کا واقعہ بیان کیا ہے:۔

کہتے ہیں کہ لس بیلہ میں میر حمل کی ایک محبوبہ رہتی تھی، بہت عرصہ گذرا تھا کہ میر حمل اپنی اس محبوبہ سے ملنے نہیں گیا تھا، میر حمل کہتا ہے کہ آخر ایک دن:۔

اتکگنت پیگھام گوں گداریگان
بانک ءِ مسک و میلبا نیگان
کوھسری کبگ ءِ کراھمگانیگان
لسوین آہوگ ءِ محبانیگان
گوں، درد پیں نودان لُڈگانیگان۔

یعنی:۔ دوست کا پیغام
راہ چلتے مسافروں کے ساتھ آیا
مشک و مہلب میں بسی ہوئی بی بی نے
خوش خرام پہاڑی چکور نے
دھند لے صحراؤں کی ہرنی نے
موتی کی لڑیاں برسانے والے بادلوں کے ساتھ
ہمیں پیغام بھیجا ہے

بلوچ شاعر اپنی رزمیہ نظموں میں واقعہ کی تفصیل بیان کرنے میں
مہارتِ تامہ رکھتے ہیں واقعہ کو ابتدا سے انتہا تک اس خوبی سے بالتفصیل
بیان کر جاتے ہیں کہ سامعین کے سامنے فلم کی طرح لڑائی کا ایک سماں
بندھ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میر حمل کی یہ نظم بلا جھجک پیش کی جاسکتی
ہے۔ دوست کا پیغام پاکر میر حمل پر جو کیفیت گذرتی ہے اور جس طرح وہ
بن سنور کر دوست سے ملنے کو روانہ ہوتا ہے اس کی کوئی کڑی شاعر
کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتی، کہتا ہے:۔

من سلامان چہ جمعتاں رندی !
ڈکوں دات، میان واڈون دات ہندی
گوشتاں من ٹی ءَ راہے رنگ ءَ
بیارمنی اسپ ءَ سیاہیں شیرنگ ءَ
آدرتہ ٹی ءَ، سیاہ مزن گوتین
زینی من پشت ءَ دات مخمل سازین
پادل من تاسیں دوراں داتین
پشت ءِ وش گوشیں مہپلا نشتین
سیاہ ءَ پہ تانہ کرانکہ ءَ بشوریتین
کپتان پہ سبزین ساڈ ءِ کرّ ءَ
برتگاں شیموشی سرد رنہ ءَ
شپ اول پاس انت گوش کنگ ماہ ءَ
لپٹ قلم گوش پہ ماذیں راہ ءَ۔

معنی:۔

دوست کا پیغام سُن کر
میں، ایک مدہوش کی طرح اچھل پڑا۔
میں نے کمر کس کر،
اپنی ہندی تلوار اُس میں اٹکادی،
پھر میں نے غلام سے کہا
میرے رات کی طرح کالے گھوڑے پر
زین کس کر لاؤ
غلام نے
لمبی چھلانگیں لگانے والے میرے مشکی گھوڑے پر
مغل ساخت، کی زین ڈال دی۔
تاس کی رکابوں میں پاؤں ڈال کر
آرام دہ زین پر میں بیٹھ گیا،
سمندری ہوا کے نرم جھونکوں نے مجھے مسحور کر دیا،
مشکی کی باگیں ہلا کر،
میں نے اسے تیز خرامی پر ابھارا۔
نیلے سمندر کے کنارے کنارے
خاموش فضا کو چیرتے ہوئے، ہم جا رہے تھے،
رات کا پہلا پہر تھا۔
چاند جب طلوع ہوا تو
میرا قلم گوش گھوڑا شاہراہ پر چل پڑا تھا،

میر حمل شاہراہ پر پہنچ کر گھوڑے کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ تصورِ جانان میں کھو جاتا ہے اس کیفیت کو ایک شاعرانہ عالم کیف و سرمستی میں وہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ سننے والے پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہتا ہے:-

سیاہ تردہیان دمن نگو شانان
ہر دو سر کوڑی ءَ شمو شانان
مُل مریت مہلنج ءَ بال زیریت
من مراں بے پول ءَ بہشتیان
مُل و مہلنج من ءَ دل ءَ دوست نت
کمترءَ مل دگیشترءَ مہلنج
مجلس ءَ مہلنج پہ شپانی ءَ
مُل منی ڈکھانی ستم زیرنت

یعنی:- مشکی چھلانگیں لگاتا چلا جا رہا ہے
اور میں آواز پر کان لگائے
خاموش بیٹھا ہوں۔
ہم دونوں اس دنیا کو بھول چکے ہیں۔
میری مہ جبیں محبوبہ کی بلائیں لے،
اگر میں مرتا ہوں (تو بھی کوئی بات نہیں)،
بن پوچھے بہشت میں جاؤں گا۔
گھوڑا اور ماہ جبین محبوبہ۔
اگر میرا گھوڑا مرتا ہے تو مرے

دونوں مجھے دل سے پیارے ہیں
البتہ گھوڑا کم اور محبوبہ زیادہ
ماہ جبین محبوبہ مجھے پیاری ہے۔
رات کی محفلوں کے لئے
اور گھوڑا مجھے پیارا ہے اس لئے کہ
وہ میرے دکھوں کا بوجھ اٹھاتا ہے

اس نظم میں نظم کشی کے جو نادر نمونے ملتے ہیں متقدمین کے رزمیہ اشعار میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی، نظم کی رنگینی، زبان کی سلاست، دل کشی اور سادگی کی بدولت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس میں شعرائے متقدمین کا سا اکھڑ پن نہیں۔ تشبیہات پیش پا افتادہ اور عامیانہ ہونے کے باوجود پسندیدہ اور بلیغ ہیں۔ ملاحظہ ہو کہتا ہے:۔

نیلن کرداں سوئی تنک دپ ءَ کایاں
دستے من ڈاشاہیں بروتان انت
ییجے من لءِ سیمریں واگ ءَ !
چم جتہ سروان گردنیں سیاہ ءَ
دمب ءَ گوں ڈمبی یرتگی مرزا
ڈنٹی گوں سرواگاں ہریویان
پشتر ءَ کنزیت ونہ جنت گام ءَ
من نظر گیپتہ گوں رھیدگیں چماں
اچ من د ساری سایگے رتہ
چنی وہم ءَ اسے بتوی کھنڈے

بُوی کھنڈے یا سوحنگیں بنڑے
سوحنگین بنڑے یا راھسری سنگے
راھسری سنگے یا کوھسری مٹے
چونہ زانتاں کہ لُڈھویں شیرے

اب کہ میں تھوتی ندی کے تنگ دھانے پر پہنچا
میرا ایک ہاتھ چڑھی ہوئی مونچھوں پر تھا
اور دوسرا گھوڑے کی سیمکار باگ پر
کہ اچانک
میرا ہرن جیسی گردن والا مشکی گھوڑا بدک گیا،
اپنی دُم کو دُمچی کے ساتھ
اور اپنے سر کو ہرات کی بنی ہوئی لگام کے ساتھ
جھٹک کر اوپر کو اُٹھا لیا۔
میں نے دیکھا کہ اب وہ (گھوڑا)
پیچھے ہٹتا ہے لیکن آگے قدم نہیں بڑھاتا
پھر جو میں نے اپنی سُرخ آنکھوں سے گھُور کر دیکھا،
تو مجھے سامنے ایک سایہ ابھرتا ہوا نظر آیا،
میرے خیال میں
وہ کسی ٹوٹے ہوئے بند کا شگاف ہے۔
کسی جھاڑی کا جلا ہوا تنا ہے۔
راستے پر پڑا ہوا کوئی بڑا سا پتھر ہے۔

یا پھر کوئی پہاڑی ریچھ ہے۔

میں نے یہ نہ جانا کہ

وہ تو ایک اتنا بڑا شیر ہے۔

شیر کو دیکھ کر حمل پر جو کیفیت گذری، سو گذری لیکن حمل
شیر کو جو خیال آیا، اس کے ادراک کرنے میں شاعر کی قوت منی
نہیں کی، اندھیری رات میں ایک اکیلے گھوڑ سوار کو دیکھ کر شیر
خیال آسکتا ہے اس کا ادراک یہی ہو سکتا ہے۔ جو میر حمل نے
کہتا ہے:-

ھیوک دتھنا شیر من ءَ گندیت
نعرگان جنت ودیم پہ من بتریت
سست ونامردانی دلاں دزیت
شیر حاریت اے حانگیں مردے
یا جنوزانی حام دپین نبچے!
یا شپانکے یالا گھریں بچے!
یا بیلوی جدگالے نرحالین
دانگ اللہ ءَ من امشپی وردے
من گونے چوری ءَ کنان گردے
امشپی شام ومنی شہبی دل دردے

یعنی:-

مجھے اکیلا دیکھ کر شیر گرجتا ہے۔
اور میری طرف جھپٹ کر آتا ہے۔

اُس کی گرج سُنکر
بزدلوں کے دل پھٹ جاتے ہیں۔
شیر اپنے دِل میں یہ سمجھتا ہے کہ
یہ کوئی ڈرپوک شخص ہے۔
یا کسی بیوہ کا بزدل بیٹا ہے۔
کوئی گڈریا ہے
یا اونٹ چرانے والا کوئی دُبلا پتلا ساربان
یا پھر لس بیلے کا کوئی بھولا بھٹکا جدگال ہے
خدا نے مجھے آج رات کی خوراک بہم پہنچائی ہے۔
اِس لڑکے کو مار کر میں عیش کروں گا،
میری آج رات کی خوراک
اور کل صبح کے ناشتے کے لئے کافی ہے۔

بلوچ شاعر، سچائی کی جو تصویر ابھارتا اور پیش کرتا ہے وہ اپنی سادگی کے باوجود دلکش و دلنشین ہوتی ہے۔ بلوچی کو عام طور پر ایک پسماندہ قوم کی پسماندہ زبان خیال کیا جاتا ہے۔ دوسروں کی تو بات الگ کیا خود بلوچ بھی بسا اوقات بعض بد اندیشوں کے قائم کردہ اس مفروضے کو حقیقت اور صحیح تسلیم کر لیتے ہیں۔ محض اس لئے کہ اس دور کے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اور بالخصوص اردو سے متاثر ہمارے شعرائے کرام اپنی زبان کے ادبی سرمائے سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوتے حالانکہ بلوچی کا ادبی سرمایہ درحقیقت ان شعرا کے کلام میں پوشیدہ ہے جنہیں

وہ جاہل شاعروں کی تُک بندی یا ڈوم گوئیوں کی چرب زبانی کہہ کر در
نہیں سمجھتے۔ بلوچی کی ایک مثل مشہور ہے کہ "اپنے ریشم کا رنگ پھیکا نظر آ
ہمارے تعلیم یافتہ بلوچوں کو بھی بلوچی شاعری کی یہی پھیکی صورت نظر آ
ورنہ جس شخص نے تھوڑا بہت بلوچی زبان و ادب کا مطالعہ کیا ہو اور فار
پشتو، سندھی، پنجابی اور اُردو وغیرہ ہمسایہ زبانوں کے ادبیات سے بھی
واقفیت رکھتا ہو، اُسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنی تمام تر کسمپرسی اور
توجہی کے باوجود بلوچی اگر اپنی ہمسایہ زبانوں سے زیادہ حسین اور زیادہ فص
بلیغ نہیں تو اُن میں سے کسی ایک سے کم بھی نہیں، یہ اور بات ہے کہ از
عالم کی سیاسی رست و خیز کی گرانباری نے بلوچ قوم کو اب تک یہ موقع
نہیں دیا ہے کہ وہ اپنے قومی تقاضاؤں کے مطابق اپنی زبان کی ساخت
و پرداخت کی طرف بھی توجہ دے سکے

بلوچی شاعری ہمیشہ سے عوام کی شاعری رہی ہے اس لئے اس میں وہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ نہیں پائی جاتی، جس سے سرمایہ دارانہ ذہنیت متاثر ہوتی ہے۔ اور نہ ہی اس میں عریانیت کی وہ آتش انگیزیاں ملتی ہیں جو سرمایہ دارانہ دور کے ادبیات کی مقناطیسی کشش کا سبب ہوتی ہیں۔ بلوچی غیور اور سادہ دل عوام کی زبان ہے۔ جسے اب تک شہری زندگی کی فضا میسر نہیں آئی ہے۔ اس لئے اس کے تشبیہ و استعارے، کہاوتیں اور امثال عام فہم اور سادہ ہوتی ہیں مگر اس سادگی میں بھی جو تاثر دیتی ہیں وہ حسن فطرت کی رنگینی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ میر حمل کی اسی نظم میں تصوریت کی جو مثالیں ملتی ہیں ان سے اس کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت ملتا ہے میر حمل شیر کو جب دھاڑتے اور چھلانگیں مارتے دیکھتا ہے تو اس کے شاعرانہ

ہوز میں یہ آتا ہے کہ شاید شیر اُسے بُزدل اور کمزور شخص سمجھ کر اُسے آزمانا چاہتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بپھرے ہوئے شیر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

چوتکو لالا ، منی شیر شکارانی
من نہیان دستواہ ! بزگل مردے
یا جنوزانی حام دہین بچے !
من حمل جتسیذاں مڑا یانی
سے جن ءِ جود دواجہ بورانی

اے میرے بھائی! اے شکار مارنے والے شیر
ایسی بات مت سوچو!
اے میرے دوست! میں بکریاں چرانے والا
کوئی گڈریا نہیں ہوں۔
اور نہ ہی میں
کسی بیوہ کا بزدل بیٹا ہوں۔
میں تو جتینذ کا بیٹا
وہ لڑاکا حمل ہوں۔
جو تین بیویوں اور کئی بور گھوڑوں کا مالک ہے۔

اُن دنوں چونکہ بلوچی شعرا کی نظمیں تحریر میں نہیں آتی تھیں محض گویتے زبانی یاد کر کے گاؤں گاؤں پھر کر شبینہ محفلوں میں گا کر سنایا کرتے تھے۔ اس لئے ان میں اکثر تحریف رہی ہے آج جب ہم انہیں چھان

پھینک کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک شاعر کی کہ
اشعار کسی دوسرے شاعر کی اسی بحر کی نظم میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں
بلوچی علاقے کے گویے عموماً نظم میں کچھ گھٹانے اور بڑھانے کے
اپنی علاقائی بولی میں اُسے ڈھالتے رہے ہیں اور اس طرح نظم کی
صورت بنتی اور بگڑتی رہی ہے۔ میر حمل کی زیر بحث نظم کے تین
(version) اس وقت میرے سامنے ہیں ان میں سے ہر ایک
دوسرے گفتہ سے بعض صورتوں میں واقعہ کو مختلف رنگوں میں بیان
ہے۔ مثال کے طور پر ایک دوسرے گفتہ میں شیر سے مخاطب ہو کر
حمل کہتا ہے:۔

اِنّہ اُو شیرءِ چکّ نہ سرحالین
من کُش ءِ کُلّ ءِ بنیاں مردے
نےَ ذالوں پہ بونڈا کور کنت چمّاں
نے من ءِ بیش ءِ جنتری نیادنت
من ہی ہوت ءِ کتریں براتان
تیگھ من زریان ءِ جتہ سوزین!

یعنی:۔

نہیں! اے شیر کا تا سمجھ بیٹھا
میں کندھے پر مشکیزہ اٹھانے والا
(گڈریا) نہیں ہوں
اور نہ ہی میں ایسا شخص ہوں کہ
بیوی میرے سر پہ چپت مارا کرے

یا بیٹھنے کو میرے لئے پیش (مزری) کی چٹائی بچھا دے۔
میں تو اس ہوت کا چھوٹا بھائی ہوں۔
جس نے میدان جنگ میں سبز تلوار چلائی ہے۔
میرے گنفتہ میں شیر سے مخاطب ہو کر میر حمل کہتا ہے۔

من حمل جیئند ان مڑا یانی
ہپت مزن پادنکیں جن ءِ جودان
یکے من شال ءُ دومی من شیشار
سیمی من مستونگ ءِ پدرنگ ءَ انت
چارمی سیوائی کلات ءَ انت
پنجمی حاران ءِ گدرا کان انت
ششمی پنجین ءَ گیا بین ءَ
ہپتمی کشکانی اداریگ ءَ
سیاہ ومن ایشان پہ یک شپ ءَ گولن
آنگہ منی کوہباز پہ نیم شپ ءَ زین انت
ہو شوں گون جدگال ءِ جنگ ءَ انت

میں جیئند کا بہادر بیٹا حمل
اور بڑے کڑوں والی سات بیویوں کا خاوند ہوں
جن میں سے ایک شال (کوئٹہ) میں
اور دوسری شیشار میں ہے
تیسری مستونگ کے ڈھلوان پر
چوتھی سیوا کے قلعہ (قلات) میں۔

کے پرخار علاقے میں۔
پانچویں خاران کے
چھٹی، پنجگور کے سبزہ زار میں
ساتویں جہاں راستے ملتے ہیں۔
ان سب کے پاس میں اپنے مشکی گھوڑے پر
ایک ہی رات میں
گھوم پھر کر آتا ہوں،
اس کے باوجود، میرا پہاڑی شاہباز (گھوڑا)
آدھی رات کو زین کسا تیار رہتا ہے۔
اور میں جدگال کی بیٹی کا تصور کیے ہوتا ہوں۔

بہرحال، اب میر حمل اور شیر کی لڑائی شروع ہوتی ہے۔ حمل
اپنی سیوائی کمان پر چلہ چڑھا کر شیر ببر پر سات، آٹھ تیر کھینچ مارتا
لیکن شیر ان تیروں کو اپنے سینے پر روک کر آگے کو جھپٹتا رہتا
اس وقت میر حمل کی تلوار پکار کر اس سے کہتی ہے:

جی منی واجہ، شیر شکارانی!
جی منی واجہ، بھنگ و میکانی
دست ملرزنت ودل نقیب سیاہین
نیزے زرزرین رہوں ڑیل دے
من پلاشانی بندگ ہوجاءَ
گردنانی کا ٹمریلی چتر ینر ینان
گردنانی کا ٹمریلی نہ ترینزغیان

نیم شب ء سیگاروں حرام باتان
شانگ و تیماروں جنگا نی !

اے میرا مالک ! شیروں کا شکار کرنے والا۔
اے میرا مالک ! کیف و مستی سے سرشار
اور بوئے مشک سے معطر !
دیکھ ! کر تیرے ہاتھ نہ کانپیں،
اور تیرا کالا دل کمزور نہ پڑ جائے،
ایک بار میری متقاطیسی دھار کو
اُس مقام پر مار دے،
جہاں پر اس کی گردن کندھوں سے آکر ملتی ہے۔
پھر دیکھ کہ میں کیسے گنّے کی طرح
اس کی گردن کاٹ کر پھینک دیتی ہوں۔
اور اگر میں اس کی گردن کو
گنّے کی طرح کاٹ کر نہ پھینک سکی
تو آدھی راتوں کو لڑکیاں
میرا جو بناؤ سنگار کرتی ہیں؛
وہ مجھ پر حرام ہو،
اس عرصہ میں شیر چھلانگیں مارتا ہوا میر حمل کے قریب پہنچ
جاتا ہے، تب میر حمل کہتا ہے کہ :
من وتی میان ءُ رجتان ہندی

یعنی :

پہ ہما زشیرءَ چگھل داتان
گردن دگرہیءَ آڑ اینتان
تل گیتین شیر چو سرکنڈی دارءَ
کپتہ منی لالیں موزگی پادان۔

یعنی:۔ اب میں نے اپنے میان کی ہندی تلوار کھینچ لی،
اور نر شیر کے کندھوں سے اُوپر
گردن پر کھینچ ماری۔
شیر، سرکنڈے کی لکڑی کی طرح کٹ کر گرا۔
میرے لال موزوں والے پاؤں پر۔

شاعر کی رمز شناسی اور دل آگاہی ملاحظہ ہو کہ ایک طرف
حمل موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ایک گرجتے دھاڑ
شیر ژیان سے مقابلہ ہے، مگر دوسری طرف اُسے اپنی منزل
بھی خیال ہے، راتوں رات وہ اپنی محبوبہ کے پاس کیسے پہنچ
شیر کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد میر حمل کہتا ہے۔

شپ کسان اِنت دبانگ دِنت مُلّا
شپ کسان اِنت دچون کنت اَلّا۔
کہ دیر نت منی مہرنگ گوں گورگین گھُل ءَ

یعنی:۔ رات چھوٹی ہے،
مُلّا صبح کی اذان دینے والا ہے۔

نہ جانے خدا کو کیا منظور ہے
رات چھوٹی ہے
اور میری ماہ پیکر محبوبہ کا سفید خیمہ
یہاں سے بہت دور ہے۔

میر حمل شیر کو مار ڈالنے کے بعد اُس کے پنجے کاٹ کر اپنے گھوڑے کے توبڑے میں ڈال دیتا ہے، اس لئے کہ :۔

نوان گنگرے کھنگانی دپ ءَ ریزونت
من بروتان دتہتگاں کھندی

یعنی :۔

شاید کل کوئی اور بانکا نوجوان
مُنہ بنا کر اور مونچھوں پر تاؤ دے کر
قہقہہ لگا کر یہ دعوے کرے
کہ شیر کو اس نے مارا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ بلوچ شاعر ہر بات کو اس تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ سامعین کی آنکھوں کے سامنے واردات کی ایک بھرپور اور منہ بولتی تصویر کھینچی چلی آتی ہے۔ شاعر میدانِ جنگ میں ہے یا محبوبہ کے حضور میں، جو کچھ اور جیسا کچھ دیکھتا ہے، اُسے من و عن الفاظ کا جامہ پہنا کر نظم کر دیتا ہے، آگے چل کر اس کی کئی مثالیں اُبھریں گی، میر حمل رات کا پچھلا پہر اپنی محبوبہ کے ساتھ ناز و نیاز میں گزارنے کے بعد اسی راستے سے واپس آتا ہے۔ جس پر شیر سے اُس

اس دور کی دوسری رزمیہ نظم مکران کے ملک دینار گچکی سے منسوب ہے۔ اِس نظم میں اس لڑائی کا تذکرہ ہے جو بقول شاعر ملک دینار گچکی اور نادرشاہ ایرانی کے درمیان لڑی گئی۔

نظم میں ایرانی کے بجائے لفظ ترک استعمال ہوا ہے۔ اس ضمن میں ہم پہلے بھی ایک مقام پر اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ بلوچ شاعروں نے ہر جگہ ایرانی، افغان، مغل اور یہاں تک کہ انگریزوں کے لئے بھی لفظ ترک استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بلوچ ان اقوام کو ترک سمجھتے رہے ہیں۔ یا پھر چونکہ ان کی سپاہ اکثر ترکوں پر مشتمل ہوتی تھی جو نسبتًا زیادہ لڑاکے ہوتے تھے، اس لئے بلوچ شعراء ان سب کو ترک ہی کہتے تھے۔

ملک دینار گچکی اور نادر شاہ کی لڑائی کا واقعہ اس طرح ہوا کہ گچکیوں کے کیچ میں برسرِ اقتدار آنے سے قبل اس علاقے پر بلیدیوں کی حکومت تھی۔ گچکی جن کا سردار ملک دینار تھا مذہبًا ذکری طریقت کا پیروکار تھا، اور بلیدی جن کا سردار شے بلال تھا سُنّی مسلمان تھے، ذکریوں نے ملک دینار کی سرکردگی میں بلیدیوں پر حملہ کر کے شے بلال کو مار ڈالا اور کیچ کی حکومت پر قبضہ کر لیا، یہ واقعہ غالبًا ۱۷۵۶ء میں ہوا۔

شے بلال کے ورثا جان بچا کر بھاگ گئے اور بقول شاعر شے عیسےٰ بلیدی نے ایران جا کر نادر شاہ سے امداد طلب کی، اسی سلسلہ میں یہ لڑائی لڑی گئی جس کا بیان اس رزمیہ نظم میں ملتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:۔

ہر دیں شے بلال ءَ کشتہ

عیسےٰ مس سرءَ گل مشتہ
فریادی شتہ گوں شاہءَ
دمیہ نادرءَ شیرازءَ

یعنی:- جب اُس (دینار) نے شے بلال کو مار ڈالا۔
عیسےٰ نے اپنے سر پر مٹی ڈال لی۔
اور بادشاہ کے پاس فریادی گیا
نادر کے پاس شیراز چلا گیا۔

نظم، زبان کے لحاظ سے فارسی آمیز ہے جو ایران سے قربت کی وجہ سے مکران کی عام زبان ہے۔ البتہ اسلوب میں ندرت اور الفاظ میں شکوہ بدرجہ اتم موجود ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے۔ دور متقدّمین کے شعرا قافیہ کی پابندی نہیں کیا کرتے تھے۔ صرف بحر کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ بسا اوقات ہم قافیہ اشعار بھی ہوتے تھے، لیکن قافیہ باندھنا ضروری نہیں تھا، لیکن اس نظم میں مثنوی کی طرز میں قافیہ کا خیال رکھا گیا ہے جو اس وقت کی بلوچی شاعری میں ایک جدّت معلوم ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کوئی پڑھا لکھا شخص یا ملا ہوگا، بہرحال یہ نظم بلوچی رزمیہ شاعری میں اپنا منفردِ مقام رکھتی ہے۔

واقعہ کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ نادر شاہ نے عیسےٰ کی امداد کو لشکر لے کر شیراز سے گوادر پہنچا اور یہاں اُس نے دینار کے پاس اپنا ایلچی روانہ کیا،

شاہ کہ اتگگت من گوادر
تمبوراشں نباستہ ہرگوَر
شاہ ءَ چھپترے شُشتاتگ
دینار ءَ دھڑکا داتگ
انگا زندگنت نادرشاہ
پرچے گپتگے خلق ءِ جاہ

یعنی :- بادشاہ گوادر پہنچا
اور ہر طرف اُس نے اپنے خیمے نصب کرائے
(یہاں سے) بادشاہ نے ایلچی بھیج کر دینار کو دھمکی
نادر شاہ اب تک زندہ ہے۔
تم نے لوگوں کا حق کیوں چھین لیا ہے۔

اگرچہ واقعہ کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے اور ایران کے مشہور
بادشاہ نادر شاہ کا گوادر آنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا، لیکن چونکہ ہم
بلوچ قوم کی تاریخ نہیں لکھنی بلکہ بلوچی رزمیہ اشعار پر بحث مقصود
ہذا واقعہ کی تاریخی سچائی کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے نادر شاہ
کوئی سردار گوادر آیا ہو، اور اس نے ملک دینار کے ساتھ معاملہ کیا ہو
سے بھی غرض نہیں، ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ شاعر نے اس واقعہ کو رز
انداز میں کس طرح نظم کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ملک دینار گچکی نے نا
کو ترکی بہ ترکی جواب دیا، ممکن ہے یہ بھی ایک شاعرانہ تعلی ہو لیکن
شاعر نے اسے جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے ایک بلوچ سر

کی جرأت اور خود اعتمادی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے، کہتا ہے:-

دینار ءَ جواب چو داتگ
شیری گھرگ ءَ پرماتگ
من پہ حاکمان ءَ کھندان
چون ءَ یلہ دیان ہندان
مرگ پہ آدمی ءَ سکت انت
چوشین جاگہان مرگ حق انت

یعنی:-
دینار نے اس طرح جواب دیا،
اور شیر کی طرح غراتے ہوئے فرمایا۔
جبکہ تمہارے جیسے حاکموں پر میں ہنستا ہوں۔
تب یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ
تمہارے ڈر سے یہ علاقے میں خالی کر دوں۔
آدمی کے لئے اپنی جان دینا مشکل ضرور ہے
لیکن ایسے موقعوں پر
اپنی جان کی بازی لگا دینا فرض ہو جاتا ہے

ایلچی نے واپس جا کر نادر شاہ کو جب ملک دینار کا جواب سنایا تو نادر شاہ بھڑک اٹھا اور اپنی سپاہ کو لڑائی کے لئے تیار ہونے کا حکم دے دیا، نادر شاہ کی اس کیفیت کا شاعر نے نہایت دلکش پیرایے میں بیان کیا ہے: نظم کا یہ حصہ شاعر کی تمام ذہانت کا ... کا مظہر اور رزمیہ منظر کشی کا ایک اچھا نمونہ ہے، الفاظ موزون، بندش

چست اور زبان شُستہ اور سلیس ہے، شاعر کہتا ہے کہ جو نہی
نادر شاہ کو ملک دینار کا جواب سنایا تو:۔

زہر کپتگ مزن نادر شاہ
دست ءَ اچ چلیمی شپتگ
دینار ءَ دو دشمان داتگ
نکک چین ؤتی پر ماتگ
جار چیناں ! جنہت ہر جاہ
جنگی در رچنت مردی کار
ترک ءِ پیادگ و جنگی سوار

یعنی:۔
نادر شاہ بہت زیادہ ناراض ہوا۔
چلم دحقہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا،
دینار کو دو گالیاں دیں۔
اور اپنے ڈھنڈورچی کو حکم دیا کہ
اعلان کرنے والے ہر جگہ اعلان کر دیں کہ
لڑائی کے لئے لڑاکے مرد
ترک پیادے اور لڑاکے گھوڑ سوار
فوراً جمع ہوں۔

نادر شاہ کے اس اعلان کے بعد جو حالت ہوئی، شاعر نے اُ
بہ نہایت عاجزی سے بیان کیا ہے:۔

توار گرت پراہ دیپی کرز باں

ڈھول و نوبت و سرنا اِن
چانگو رَ جھنگ . کیچ ءِ شیر
دینار گوں براق و شمشیر
ترکان ءَ تہ تت چو شیں گت
جنگ ءَ ایر کپیت دینار دت

ترجمہ: چوڑے منہ والی قرنائیں بج اُٹھیں۔
ڈھول اور نقاروں پر چوٹ پڑی۔
اور شہنائیاں چیخنے لگیں۔
اس طرف سے کیچ کا شیر دینار
تلوار باندھے، اپنے براق صفت گھوڑے پر سوار
میدان جنگ میں کود پڑا۔
ترکوں کو یہ گمان نہ تھا کہ
لڑائی کے لئے دینار خود میدان جنگ میں نکل آئے گا۔

شاعر نے اسی ایک شعر میں کہ بہ
ترکوں کو یہ گمان نہ تھا کہ
لڑائی کے لئے دینار خود میدان جنگ میں نکل آئے گا۔
وہ بات کہدی ہے جسے کہنے کے لئے ایک پوری نظم بھی کافی نہ ہوتی۔
شاعر نے اسی ایک شعر میں وہ تمام کیفیت بیان کر دی ہے جو دینار
کی وجہ سے نادر شاہی سپاہ کے ترک سپاہیوں پر طاری تھی اسے
آپ ترکوں پر دینار کا خوف و رعب کا پڑنا کہیں یا بادشاہ کے

مقابلے میں لڑنے کیلئے دینار کی جرأت کا اظہار کہیں، دونوں مورخ
میں دینار کی مردانگی، بے باکی اور جرأت مندی ظاہر ہوتی ہے
اُس دن ایرانیوں اور بلوچوں میں بہت شدید لڑائی ہوئی
نے اس لڑائی کا بیان بھی بظاہر صرف دو شعروں میں کیا ہے لیکن
سے دیکھا جائے ان دو شعروں میں بھی ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے

کہتا ہے:

آرو چ بیتگت جنگ سکّ ءَ
گوں زہم و نیزگ و توپکّ ءَ
بے شکّ کہ بلوچ باز مُرتگ
بلے ترکان ءَ تہی در کُرتگ

یعنی:

اُس دن شدید لڑائی ہوئی
تلواروں، نیزوں اور بندوقوں سے
خوب کام لیا گیا،
بے شک اس لڑائی میں بلوچ بہت مرے
لیکن انہوں نے ترکوں کا بھی بھرکس نکال دیا۔

اس دور کی ایک دوسری رزمیہ نظم نصیر خان نوری، خانِ قلات
اور احمد شاہ ابدالی شاہِ افغانستان کے درمیان لڑائی سے متعلق ہے
اس نظم کا مصنف نصیر خان نوری کے دربار کا ملک الشعراء جام درک
ہے، یہ نظم بھی اسی واقعہ کی ایک کڑی ہے جو ملک دینار گچکی اور
شاہ نادر شاہ ایرانی کے درمیان رُونما ہوا۔

بلوچستان کی تاریخ مختصر ہے کہ ملک دینار گچکی کے ہاتھوں شکست
کھا کر شے جال کے ورثاء گوادر پہنچے اور وہاں سے میر نصیر خان نوری کے
پاس فریادی قلات چلے گئے۔ میر نصیر خان نوری نے ان کی امداد کو ایک
فوج لے کر کیچ مکران پر حملہ کر دیا۔ متعدد لڑائیوں کے بعد ملک دینار
شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ ملک دینار اب تک میر نصیر خان نوری کی قید
میں تھا کہ ایک بلیدی نے شے جال کے خون کے عوض میں اسے قتل کر دیا۔
ملک دینار کے ورثاء کیچ سے فرار ہو کر احمد شاہ ابدالی کے پاس فریادی
قندھار چلے گئے۔

احمد شاہ ابدالی نے میر نصیر خان نوری کو خاص قاصد کے
ذریعے ایک تہدیدی فرمان بھیجا کہ وہ فوراً کیچ کے علاقے کو خالی
کر دے، نصیر خان نوری نے حکم کی تعمیل کی، کیونکہ وہ اس وقت اپنے
دار الحکومت سے پانچ سو میل دور تھا، جبکہ قلات احمد شاہ ابدالی
کی دسترس میں تھا لیکن قلات پہنچ کر میر نصیر خان نوری نے احمد شاہ
ابدالی کے ساتھ اپنے تمام تعلقات منقطع کر دیئے اور افغان باشندوں
کو اپنے حدود مملکت سے باہر نکال دیا، اس پر احمد شاہ ابدالی نے بلوچستان
پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجہ میں یہ لڑائی ہوئی۔ جس کا بیان جام دُرک
کی اس رزمیہ نظم میں ملتا ہے:

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے نظم کی ابتدا متقدمین کے دستور
کے خلاف مذہبی اشعار سے ہوئی ہے زاں بعد اصل واقعہ کی طرف
رجوع کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:۔

سَرِین ءِ جابریں قندہار ءِ اوگھان
جَتئیٔ دل دِ گپتیٔ کیچ و مکران
گیابیں آگرہ و داں شہر سِکھان
بیائنت بادشاہی امر و فرمان
پڑھتی خط و دیتیٔ پہ دل وجان
سر و چمّ دیدگانی داشتہ فرمان

یعنی

شمال سے قندہار کے جابر افغانوں نے
دہلی کو لوٹنے
مکران پر قبضہ کرنے
آگرہ کی سرسبز وشاداب وادی
اور سکھوں کے شہر (امرتسر) کو
پائمال کرنے کے بعد
(نصیر خان نوری کو)
ایک شاہی امر و فرمان بھیجا۔
(نصیر خان نے) خط کو پڑھا۔
اور سر آنکھوں پر رکھکر
دل وجان سے تسلیم کیا

فرمان کی نوعیت کیا تھی اور اس میں نصیر خان احمد شاہ کی طرف سے کس انداز میں اور کیا لکھا گیا تھا، شاعر نے دو شعروں میں اسے نہایت خوبصورتی سے اور مؤثر انداز میں بیان کیا۔

کہا ہے:-

چی مردے کہ در آختہ اود ملکؑ ءَ
منوئیٰ پروشان دگٹّ ءِ مدرکؑ ءَ

یعنی: (اے نصیر خان)!
تم کون ہوتے ہو ملک (دینار) سے
انتقام لینے والے،
(باز آجاؤ، ورنہ)
ہم تمہاری گردن توڑ دیں گے،

میر نصیر خان نے بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کی اور فوری طور پر کچھ سے کوچ کر کے قلات کی راہ لی۔ شاعر نے اس میں جو رنگ آمیزی کی ہے اور جس شائستہ طریقے سے احمد شاہ ابدالی پر طنز کیا ہے، وہ جام درک جیسے ایک باکمال شاعر کا حصّہ ہے، الفاظ موزون اور معنی صدف میں موتی کی طرح پوشیدہ ہیں ملاحظہ ہو کہتا ہے۔

رواں گوں اکبرءِ سڈّو وچکتءَ
نہ باں گوں واجہءَ کم رودجکتءَ

یعنی:- اگر یہی منشاء ربّی ہے
اور آب و دانہ کی کشش مجھے لئے چلتی ہے
تو میں واپس چلا جاؤں گا
میں اپنے مالک حقیقی کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں۔

مراد یہ ہے کہ میر نصیر خان نوری علماء اسلام کے فتاوی

مطابق طائفہ ذکری کو جو نماز کے منکر تھے اسلام سے خارج

تھے اس لیئے اُن کے خلاف جنگ کرنے کو مذہبی جہاد خیال کرتے

شاعر ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے

کہ میں نے خدا کے حکم کی تعمیل کی، اب اگر منشاء ربی یہ ہے کہ میں جہاد سے دستبردار ہو کر واپس چلا جاؤں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے کل قیامت کے دن میں اپنے رب کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں کہ میں نے اپنے فرض کی بجا آوری میں غفلت کی، البتہ قابل مواخذہ وہ مسلمان بادشاہ ہے جو مجھے اس فرض کی بجا آوری سے روک رہا ہے۔ جام درک گو کہ ایک غزل گو اور صوفی منش شاعر تھا رزمیہ میں اُسے بالاچ اور دور متقدمین کے رند و دودائی شاعروں جیسی دسترس حاصل نہیں تھی، لیکن بحیثیت شاعر و فنکار بلوچی زبان کو جو وسعت، گہرائی اور رنگینی جام درک نے عطا کی ہے اُس کی نظیر نہیں ملتی۔

بلوچی کے شاعروں میں جام درک پہلا شخص ہے جس نے تصور و تخیل کو الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ترجمہ میں شعر کی خوبصورتی اور حسن بیان قائم نہیں رہ سکتا، صرف ترجمۂ معنی ہاتھ آتا ہے جو گراں قیمت سہی وجد انگیز نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود بھی جام درک کے اشعار ترجمے میں بھی جاندار لگتے ہیں، بہر حال کیچ سے میر نصیر خان نوری کی روانگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے جام درک کہتا ہے :-

تیزیاں سنج کرتنت اسپ کلمیر
ھدا حکم ءَ گوں بستہ میان ءَ زر زہیر
جتہ منزل پہ منزل، روچ وشگیر
شتہ من ھلکواں در کپتگنت دیر

یعنی :-
نوکروں نے (خان کے) گلرنگ گھوڑے پر زین ڈال دی
اور اُس نے خُدا کے حکم سے
اپنی مقناطیسی تلوار کمر میں باندھ لی۔
اور پھر رات دن ایک کر کے
اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔
یہاں تک کہ (مکران کے) علاقے سے
بہت دور نکل گیا۔

قلات پہنچ کر میر نصیر خان نے احمد شاہ ابدالی سے اپنے تمام تعلقات منقطع کر لئے اور افغان باشندوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔ احمد شاہ ابدالی کے جاسوس بھاگ بھاگ کر قندہار پہنچے اور اسے میر نصیر خان کے اس اقدام کی اطلاع دی، شاعر نے جاسوسوں کی اس کیفیت کو جس چابکدستی اور مہارت سے بیان کیا ہے اُس سے خوف کے علاوہ نصیر خان نوری کی فوجی طاقت اور اسلحِ جنگ کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہتا ہے :-

تچو کیں شاتراں آرستہ سہادا
دپش تزنت نہ تنت آواز وآدءَ

دزد ستی ٹپتی گوں ظلّ اللہؑ

نصیر خانءَ نہ ئیت کسے نگاہءِ

نصیر خانءِ دل انت گوں جنگءَ جاہءِ

جمع کل لیکھوی فوج چل ہزار نت

سرئے گوں توپ و جنگی جزار نت

سرئے گوں رہکلاں تنت و گھبار نت

سرئے گوں ھل پوش و نیزہ دار نت

سرئے گوں اسپر و سنریں سگھار نت

یعنی :- تیز دوڑنے والے جاسوس صبح وہاں پہنچے۔

ڈر سے اُن کا مُنہ بند ہو چکا تھا

مُنہ سے آواز ان کی نہیں نکلتی تھی،

ظلّ اللہ (بادشاہ) کے سامنے جاکر

انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹا

اور رو رو کر کہا کہ :

نصیر خان کسی کو نظر میں نہیں لاتا

نصیر خان (کا دل) آپ سے لڑنا چاہتا ہے۔

اس کی کل چالیس ہزار فوج جمع ہے

جن کا ایک حصّہ بندوقوں اور جنگی جزار[1] سے مسلح

ایک حصّے کے پاس رہکل[2] اور غبارے ہیں

[1] ایک قسم کی بڑی بندوق۔ [2] ایک قسم کی چھوٹی توپ جو اوپر کو قلعوں میں گولے پھینکتی ہے۔

ایک حصہ زرہ پوش اور نیزہ دار گھوڑ سواروں کا ہے
ایک حصے کے پاس ڈھالیں اور سبز تلواریں ہیں

احمد شاہی سپاہ سے متعلق صرف ایک بیت ہے اور اسی ایک مصرعے میں وہ سب کچھ بیان ہوا ہے جسے بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ تعداد کی کثرت اور تباہی و بربادی پھیلانے کی حیرت انگیز طاقت بلاشبہ جام درک ہی ایک مصرعے میں اس مضمون کو سمیٹنے کی استعداد رکھتا تھا، کہتا ہے:-

مدگی فوجی کاتنت مہل جارءَ

یعنی اُس کی فوج، ٹڈیوں کے دَل
اور چڑیوں کے جھنڈ کی طرح چلی آرہی تھی،

احمد شاہی سپاہ کو ٹڈی دَل اور چڑیوں کے جھُنڈ سے تشبیہہ دینا موزوں بھی ہے اور ایک بلوچ کے لئے عام فہم بھی۔ ٹڈیوں کے دَل اور چڑیوں کے جھنڈ جس کثرت سے آتے ہیں اور سبزہ زار و میوہ دار درختوں اور فصلات میں جو تباہی پھیلاتے ہیں وہ کسے معلوم نہیں، اور کون ان سے خوفزدہ اور حواس باختہ نہیں ہوتا،

اس تشبیہہ سے جہاں احمد شاہی سپاہ کی کثرت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اس کی پھیلائی ہوئی تباہ کاریوں اور بربادیوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔

دونوں افواج کی تعداد اور ساز و سامان کے بیان کے بعد شاعر سرداران اور جہلاوان کے ان قبائل کی بھی تعریف کرتا ہے،

جنہوں نے میر نصیر خان نوری کا ساتھ دیا، کہتا ہے:

ہزار جسّ انت سراوان، جھلوان ءَ
حلالنت نیمکش دارتنت گوں خان ءَ

یعنی:۔
سراواں اور جھلاوان کے لوگوں کو ہزار آفرین ہے
خان کے ساتھ انہوں نے جو نمک کھایا ہے۔
وہ اُن پر حلال ہے۔

یہاں پر خان کے ساتھ نمک کھانے کی اصطلاح قابل غور ہے شاعر نے "خان کا نمک کھانا" نہیں کہا بلکہ "خان کے ساتھ نمک کھانا" کہا ہے جس سے شعر کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی ہے، خان اور قبائل کے باہمی تعلقات کو روشن کیا ہے۔ قبائل خان کے نمک خوار یعنی ملازم اور دست نگر نہیں تھے، بلکہ خان کے معاون اور مددگار ساتھی تھے لڑائیوں میں سب مل کر حصہ لیتے، فتوحات اور لوٹ مار کرتے اور جو کچھ ہاتھ آتا، آپس میں بانٹ کر کھاتے اور متصرف ہوتے تھے البتہ خان کو اپنا راہنما اور بڑا مانتے اور اس کی بالا دستی قبول کئے ہوئے تھے، اس اجمال میں شاعر نے جو تفصیل بیان کی ہے یا دوسرے لفظوں میں شاعر نے جس خوبصورتی سے دریا کو کوزے میں بند کر رکھا ہے، بلوچی شعرا میں وہ صرف جام درک کا حصہ ہے۔

بالآخر لڑائی کے میدان میں دونوں سپاہ صف آرا ہوتی ہیں اس وقت نصیر خان پر جو کیفیت گذرتی ہے وہ شاعر کی عقابی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ کہتا ہے:۔

موامی گشتہ مئے خان ولہیں میر
قلات ءِ نام ءَ دیتئ جیل دزمزیر
سر دئیتاں قبول تنت موت ءِ تقدیر

میدان جنگ میں
ہمارا خان اور سب سے بڑا میر
مدہوشوں کی طرح غضبناک ہوگیا،
اُس نے انجام دیکھ لیا تھا کہ
شکست کی صورت میں
قلات کے لئے جیل اور غلامی کی زنجیریں ہوں گی
اُس نے طے کر لیا تھا کہ
غلامی کی زنجیریں پہننے
اور زندہ رہ کر اپنا ننگ وناموس
دشمن کے حوالہ کرنے سے
موت انہیں منظور ہے
جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہی ہوگا۔

جام درک کہتا ہے کہ لڑائی میں پہل نصیر خان نے کی اُس کے حملے اور دونوں طرف کے جنگجوؤں کی شمشیرزنی کا نقشہ شاعر اس طرح کھینچتا ہے:۔

جلو جنگی بڑتہ خان قہار ءَ
گردکی لہکنت سیزیں سگھاران

ملوکانی سر دڈھال د کپاران
لوہتی زر تگنت خان د سزاران

یعنی:-

خان نے غضبناک حملہ کر دیا،
سبز تلواریں بجلی کی طرح کوندنے لگیں
نجیبوں کے سروں، ڈھالوں اور پہلوؤں پر
خان اور اس کے شیروں نے
دشمن کو پیچھے دھکیل دیا،

یہ لڑائی ۱۷۵۸ء میں قلات شہر کے قریب کوہنگ کے ...
پر لڑی گئی جس میں ایک شدید مقابلے کے بعد میر نصیر خان نور...
کو پسپا ہونا پڑا۔ بلوچ لشکر قلات کے قلعہ میں محصور ہو گیا، ...
دن تک احمد شاہ ابدالی نے قلات کا محاصرہ جاری رکھا، محا...
کے دوران ایک دن عصر کے وقت احمد شاہ ابدالی اپنے خیمے ...
سامنے ٹہل رہا تھا کہ قلات کی میری (محل) سے نصیر خان نے
دوربین سے اُسے دیکھ لیا، اور اپنی شاہی نامی بندوق سے ای...
گولی چلادی۔ شاعر اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

خدائی پاکرۂ باتّے نصیر خان
وتی دُور بینی داشتنی دیدگان جوان
جتنی بہ بادشاہ ءَ نیمت پیکان
تبائی سو ختگ دلو باڑتگی جان

شتابی داتگی شاہی پہ زندءَ
نقیباں پادگتہ سلطان چہ ہندءَ
ٹکمّی پٹّتی تمبو د گھنڈءَ

یعنی:-

نصیر خان! تم پر خدا کی رحمت ہو
اپنی دوربین سے اچھی طرح دیکھ کر
بادشاہ پر اپنی بندوق سے گولی چلادی۔
جو اس کی قبا اور جسم کو جھلستی ہوئی نکل گئی
شاہی سے جلد ہی دوسری گولی بھی اس کے پیچھے چلادی
جو اس کے قریب لگی اور نقیبوں نے
بادشاہ کو فوراً وہاں سے ہٹا دیا۔
اور خیمے کی کیلیں اکھاڑ دیں

انجام کار بلوچستان اور افغانستان کے علما دین اور سادات
درمیان میں آئے، انہوں نے احمد شاہ ابدالی اور نصیر خان نوری
کے درمیان صلح کرادی، فریقین کے درمیان ایک عہد نامہ تحریر
ہوا، انگریزوں کی آمد تک جس کی پابندی فریقین نہایت سختی سے
کرتے رہے،

بلوچی کی رزمیہ شاعری، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں
زیادہ تر قبائلی جھگڑوں سے متعلق ہے، بعض لوگ ایک دوسرے
کے ساتھ لڑنے مرنے کو بہادری اور ایک شریفانہ فعل سمجھتے تھے
لئے تو ایک بلوچ شاعر کہتا ہے کہ:-

یحرانی تُمن ویران تنت !
سیت گوں شلیں جنگان تنت

یعنی:- وہ قبیلے جو امن سے رہنا چاہتے ہیں۔
تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔
فائدہ تو صرف اچھی لڑائیوں سے ہی حاصل

گو کہ بعد کو کسی شاعر نے اس شعر کو اُلٹ بھی دیا ہے لیکن حقیقت
وہی ہے جسے پہلے شاعر نے بیان کیا ہے۔

بلوچ شعرا نے جنگ سے متعلق بارہا خیال آرائی کی ہے اگر
شاعر نے جنگ کو جوانمردوں کا مشغلہ قرار دیا ہے تو دوسرے نے
کالی رات اور تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ٹھہرایا ہے۔ اس سلسلے
بلوچی کے نامور شاعر گاہی گورتیج کی رائے بھی قابل غور ہے اپنی
مشہور رزمیہ نظم میں اس نے میدان جنگ میں مرد و نامرد یعنی
اور بزدلوں کی تعریف کی ہے، یہ نظم بلوچی رزمیہ شاعری میں ہمیشہ
ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:-

بِن ءُ خان، روچِنت جنگ سیاہین شپ َنت

جنگ بِرا آمرد مرکبان جواہین روچ نہ َنت!

گہورین ہندی بنگویں ہوتان ءُ چِرنت

دوُر دیں کوٹانی سواداں زیل کننت

یعنی:۔ خان رعایا کے لئے روز روشن کی طرح ہیں

اور لڑائیاں کالی راتوں جیسی ہیں۔

لڑائیاں جوانمردوں اور گھوڑوں کے لئے

اچھے دن نہیں ہوتے

اس دن جوہردار ہندی تلواریں

بہادروں کو چرتی ہیں۔

اور آباد قلعوں کو اجاڑ کر بے لطف کر دیتی ہیں۔

بہادروں اور بزدلوں سے متعلق گاہی گور۔ یچ کہتے ہیں کہ بزدل لڑائی سے پہلے تو بڑی بڑی ڈینگیں مارتے ہیں لیکن جس وقت لڑائی کا بازارِ گرم ہو جاتا ہے تو وہ پہلو بچا کر نکل جاتے ہیں۔ لیکن بہادر ہنسی خوشی میدانِ جنگ میں کود پڑتے ہیں اور اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کے لئے تلوار چلاتے ہیں۔ کہتا ہے:۔

چندِ ہا وڑنا پہ دپ ءَ گوزان ءَ جننت

جنگ ہمو نیچا بیت، پدا پہناد ءَ گرنت

بنگویں ہوتانی رگھام ءَ ہمراہ نہ بنت

اُچ بدا، گڈۓ نشتنگ د همسو دان ورنت
گوں دوَہیں دستان پہ سروزانان ضبت
جنگانی دھکتۓ ہرچیار گنڈان ۓ ترہنت

یعنی:- کئی نوجوان اپنے مُنہ سے تو بہت بڑی ڈینگیں مارتے ہیں
لیکن جب گھمسان کا رن پڑتا ہے۔
تو پہلو تہی کر لیتے ہیں اور
بہادر جوانوں کا لڑائی میں ساتھ نہیں دیتے
بعد میں اُن کے سوگ میں بیٹھتے ہیں۔
اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر اور ران پیٹتے
اور افسوس کرتے ہیں۔
لیکن اس وقت جبکہ میدان کارزار گرم تھا۔
وہ لڑائی کی دہشت سے بدک کر
چاروں طرف بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔

ہنسی خوشی لڑائی کے لئے تیار ہونا اور میدان جنگ میں جم کر لڑ[illegible] ہر آدمی کا کام نہیں ہوتا۔ اس فرض سے صرف وہ جوانمرد ہنسی خوشی عہدہ برآ ہوتے ہیں جن کے دل سوز عشق سے منور ہوں اور جو اپنے ذمہ کا[illegible] ہی ننگ و ناموس پر سر کٹانے کو قابل فخر سمجھتے ہوں۔ اس مضمون [illegible] شاعر نے ایک عمدہ پیرایے اور سادہ و عام فہم زبان میں کنایۃً نہا[illegible] خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہتا ہے:-

گودلیں مردِ، پہ گِندگ ءَ گوری ءَ ترِمنت!
عاشقانی کارِنت کہ شادھی میدان ءَ رونت
توکل ءِ بیٹری ءَ دِل ءَ تیلانکاں دئینت
ملگی ڈیل ءَ گوں زِرہ زِرہپوش کننت
کڈھان زہریناں شرابی نوش کننت
من سگھارانی تاپتگیں جوران ءَ کپنت
گہورِیں تیگھان پہ وتی ناموت ءِ جنت

بزدل آدمی لڑائی کو دیکھکر
وحشی گورٹہ کی طرح بدک جاتے ہیں۔
یہ صرف عاشقوں کا کام ہے
جو ہنسی خوشی میدان جنگ میں جاتے ہیں۔
توکل کی کشتی کو دل کی قوت سے دھکیلتے ہیں
اپنے قدِ بالا کو زرہ پوش کرتے ہیں۔
اور زہر کے اس پیالے کو
جام شراب کی طرح نوش جان کرتے ہیں
تلواروں کی تپش سے گرم میدان جنگ کی
جان کاہیوں میں کُود پڑتے ہیں۔
اور اپنے ننگ وناموس کی حفاظت کے لئے
جوہر دار تلواریں چلاتے ہیں

۱؎ ایک وحشی مُنبہ

چوتھا باب

تیسرا دور ——— (متاخرین)

متاخرین کا دور بلوچستان کی غلامی کا دور ہے۔ شروع شروع میں جب انگریزوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا، بلوچ مجاہدین نے قدم قدم پر ان کا مقابلہ کیا۔ اور انہیں آگے بڑھنے سے روکتے رہے ان سے جو کچھ ممکن ہو سکا اور جتنی کچھ ان کی استطاعت تھی، اسے انگریزوں کے مقابلے میں مردانہ وار پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا، لیکن ایک منظم اور جدید اسلحہ جنگ سے مسلح طاقت کے مقابلے میں صرف تلواروں اور ملکی ساخت کی ڈھاڈری[1] بندوقوں سے کامیابی حاصل کرنا ناممکن تھی تھی۔ اس کے باوجود بلوچ مجاہد انگریزوں کی عالمگیر طاقت سے بے دریغ ٹکراتے اور اپنی عزیز جانوں کی قربانیاں پیش کرتے رہے

بلوچ مجاہدین کا مقابلہ صرف بیرونی دشمنوں سے نہ تھا بلکہ ملک کے اندر اُن قومی غداروں سے بھی اُن کو لڑنا پڑ رہا تھا۔ جو انگریزوں کی طاقت اور دھن دولت دیکھکر اُس کے سامنے سربسجود ہو چکے تھے جیسا کہ شاعر ریکی کہتا ہے:۔

---

[1] ڈھاڈر کی بنی ہوئی۔

پرنگی اتکنت بولان ءَ!
دینت زرّان پہ جولان ءَ

فرنگی بولان میں آئے
اور انہوں نے جھولیاں بھر بھر کر رُپے تقسیم کئے

داسنا بلاتیاں چنکاک ہُشارو
پرنگی توں دُنو بادہ و مارو
مُخے چکار تفیر زراک تیارو
(براہوی)

آج کل کے بڑوں سے چھوٹے ہوشیار ہیں
وہ فرنگیوں کے ساتھ باپ بیٹے کی طرح ہیں
جیسے ہی وہ فرنگی کی امداد کو کمر کس کر نکلے
روپے اُن کو تیار ملنے لگے۔

ریکی زنگی شاہی نوشکی کے قبیلہ ذگر مینگل کا (ریزدار) قبائلی شاعر تھا، اس نے بلوچی اور براہوی میں بڑی اچھی قومی نظمیں کہی ہیں اور بسا اوقات وہ بلوچی اور براہوی کو ایک ہی نظم میں ملا کر شعر کہا کرتا تھا اسی طرح بلوچی زبان کے نامی گرامی رزمیہ گو شاعر رحم علی بجار نے بھی انگریزوں کے خلاف بلوچوں کو ابھارتے اور غیرت دلانے کو بڑی یادگار نظمیں کہی ہیں۔
رحم علی اور اس کا باپ بجار دونوں بہت بڑے شاعر

تھے، وہ قبیلہ مری کے (ریزدار) قبائلی شاعر تھے۔ اُن کے اش
شہ مری قبیلہ میں شجاعت، مردانگی اور سرفروشی کا رُوپ
دی ہے۔ بلوچوں کا یہ نامی گرامی شاعر رحم علی ان وطن دشمن غ
متعلق اپنی طویل رزمیہ میں ایک جگہ کہتا ہے :۔

کپتگنت کوڑ آئیں تھرے بندءَ
میشیءَ پہ کافرءَ رندءَ
اشتگنت ایمانءَ ہما ہندءَ
ہرکہ پہ جوانیءَ پھرّان منتی
کلمہءَ دنت دپیسوءَ کٹی

یعنی :۔ آج کل لوگوں نے ایک غلط راستہ اختیار کیا
بھیڑ کی طرح کافر کے پیچھے چل پڑے ہیں
انہوں نے ایمان تو وہاں چھوڑ دیا ہے
جو اپنے منہ پر اچھی طرح سے خاکستر ل لگا
اور کلمہ (مسلمانی) چھوڑ دیتا ہے۔
وہ خوب پیسہ کماتا ہے۔

یہ وطن دشمن غدار لوگ قوم، وطن اور مذہب بیچ کر ج
ہیں۔ اُسے کس طرح خرچ کرتے ہیں۔ یہ بھی رحم علی بجارے
کہتا ہے۔

وڑنت چاءَ گوں لام لیٹءَ
کننت ذالکار گل ءِ چیٹءَ

یہ لوگ چائے اور لیمن پیتے ہیں۔
اور عورتوں کی ناز برداریاں کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ بلوچ آزادی خواہ مجاہدین کو جتنا نقصان ان قومی ...داروں نے پہنچایا، انگریزی افواج ان کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکیں ...وچ شاعروں نے ان وطن دشمن غداروں اور انگریزی سامراج کے ...یجنٹوں کو اپنے اشعار میں خوب دل کھول کر تاڑا۔ جہاں بھی موقع ...ہے نام لے لے کر اُن پر اشعار کے تیر چلاتے ہیں اور اُن کے کلیجے ...چلنی کرکے رکھ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آج بھی اُن وطن فروش غداروں ...ی اولاد ان اشعار کی تاب نہیں لاسکتی۔ رحم علی بجارانی کو ڈاکو اور ...یرا کہتا ہے وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر بلوچوں کو لوٹتے کھسوٹتے ...ر نیم جان کر دیتے ہیں اور اس لوٹ کھسوٹ میں وہ سب برابر کے شریک ...ہیں، کہتا ہے :-

وَردو کانی سلایکّ اِنت
چڑوَیں پیسوَءِ ٹکّ اِنت
ہمو ڈُونڈءَ دلپش سکّ انت
گھریبان ظلم دنا حکّ اِنت

قوم کو بیچ کر کھانے والے سب
ایک ہی رائے کے ہیں
اُن کی نظریں صرف پیسوں پر لگی ہوئی ہیں
(کتے کی طرح) ہر لاش پر منہ ڈالتے ہیں۔

اور غریبوں پر زیادتی اور ظلم کرتے ہیں۔

ایسے لوگ، جو قوم کے دشمن اور انگریزوں کے دلال ہوتے ہیں علاقوں کو، جہاں قوم پرور اور وطن دوست مجاہدین، اپنی آزادی کی جدوجہد میں برسرپیکار رہتے ہیں چھوڑ کر، محفوظ مقامات کی طرف بھاگ جاتے ہیں کیونکہ وہاں مجاہدین آزادی کے ہاتھوں ان کی زندگی خطرے میں ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ دشمن (انگریز) کے زیر سایہ کسی عافیت میں جا چھپتے ہیں۔ مری قبیلے کے ایسے غداروں سے متعلق رحم بجار کہتا ہے :-

شت وتزیک کتش کچھیؔ
لبیارنت گاجر و پچھی
سری شر خواریاں بچھی

یعنی :-

یہ لوگ بھاگ کر کچھی کے علاقے کے قریب جا بیٹھے
کیونکہ وہاں پر اُن کو گاجر اور مچھلی بہت ملے گی
اور تکالیف و مصائب سے اُن کی جان بچ جائے گی

ایک اور بلوچ قبیلہ سے متعلق جس نے قول و اقرار کے باوجود انگریزوں کے خلاف جنگ میں مریوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ انگریزوں کا ساتھ دے کر اس کی ملازمت بھی اختیار کرلی۔ مری قبیلے کا شاعر گُڈو ڈوم کہتا ہے :-

نگوش اُو ـــــ کوہ ءَ
من شان تراش بن ءَ دروہ ءَ

ہما، مادن ... گگشد ... ہزار بار حاکمان جنگین

ہما، ترکانی مالٹین شما گوں نوکری ءَ

بلوچی گار کتو برءَ

اے پہاڑوں پر رہنے والے ... سنو!

میں کہتا ہوں کہ تم بنیادی طور پر دھوکے باز ہو

آج پھر ہم ہیں اور وہی چٹانیں ہیں۔

وہی حاکموں کا ہم پر حملہ ہے۔

جو ہزار بار پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔

اور وہی ہماری ترکانہ سرفروشیاں ہیں

تم لوگوں نے تو نوکری کے چند ٹکوں کے لئے۔

اپنی بلوچیت بالکل گم کردی ہے۔

اس دور کے بلوچی معاشرہ میں شاعر کی بڑی عزت ہوتی تھی وہ ہر شخص اور قبیلہ کے متعلق بلا جھجک ہجو و مدح کہہ سکتا تھا جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوتے ہیں اور جن کا بیان بعد میں آئے گا، اس نظم میں گدو ڈوم نے اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا جو ۱۸۳۹ء میں قلات کے علاقہ سراوان میں پیش آیا، جبکہ انگریزوں کے لشکر نے قلات پر حملہ کرکے میر محراب خان، خانِ قلات کو شہید کردیا اور قلات کو لوٹ لیا۔ اس واقعہ پر سراوان کے سرداروں اور عوام سے خطاب کرتے ہوئے گدو کہتا ہے:-

سراوان ءُ گہیں مردان
گونہ بے عقل ءُ گردان
پرا ئیتو وتی میری
حیا اش شما شتہ گیری
شما سیاہ ءَ کنت پیار ءَ
کلات گوں لُٹّی دِ سرکار ءَ
بُڑتہ ترکان شہ بازار ءَ
کُتہ من لیڑوان بار ءَ
بُڑتہ دان کلکتہ شہر ءَ
گہنیاں دُروہ دتران بتییں!
پہ زراں دیمی سیاہ بتییں

یعنی

اے سراوان کے اچھے لوگو!
اپنی ان احمقانہ حرکتوں سے
تم نے اپنی حکومت کھودی۔
اگرچہ، حیا تم سے بہت پہلے رخصت ہوچکی تھی
اس لئے کہ تم
غلامی کی زندگی سے پیار کرتے ہو۔
قلات کی حکومت انگریزوں نے تم سے چھین لی
اور بھرپور خزانے کو لوٹ کر
اور برسر بازار نر اونٹوں پر لاد کر

کلکتہ لے گئے۔
تم سب بڑوں نے مل کر غداری کی۔
اور دولت کے لئے اپنا منہ کالا کر لیا

شاعر نے یہاں پر اس تاریخی حقیقت کا بیان کیا ہے جو بلوچستان پر انگریزوں کے حملہ کے موقع پر ظاہر ہوئی، سراوان کے سرداروں نے انگریزوں سے بڑی بڑی رقمیں لے کر میر محراب خان کا ساتھ چھوڑ دیا، جھلاوان کے سردار قادر بخش زرک زئی کے قتل کی وجہ سے خان سے پہلے بدظن اور ناراض ہو چکے تھے۔ سراوان و جھالاوان کے سرداروں نے مجموعی طور پر خان میر محراب خان کا ساتھ نہیں دیا، جھالاوان سے صرف سردار ولی محمد خان شاہی زئی مینگل جو میر محراب خان کے ماموں تھے اور سراوان سے صرف میر عبدالکریم خان رئیسانی اس لڑائی میں خان کے ساتھ رہے اور شمشیر بکف میدان جنگ میں کام آئے ۔

انگریزوں نے خان کی میری (محل) کو لوٹ لیا اور خزانہ کو جس میں جواہرات اور سونے چاندی کے بے شمار زیورات وغیرہ تھے اٹھا کر لے گئے، کہا جاتا ہے کہ قلات کا خزانہ پچاس اونٹوں پر لادا گیا، ایک اونٹ کا بار کم از کم پانچ من کا ہوتا ہے۔ اُن دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا صدر مقام کلکتہ میں تھا، اس لئے شاعر کہتا ہے کہ لوٹ کا یہ مال کلکتہ لے جایا گیا،

بلوچستان اور بلوچوں کے لئے یہ دَور مصائب و آلام کا دور تھا، انگریز اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں پھیل

گئے تھے۔ بلوچوں نے اپنی بساط بھر اُن کا مقابلہ کیا تھا لیکن اس سیل
بلاخیز کے سامنے زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہر سکے تھے۔ اب بلوچستان
میں انگریزوں کی عملداری کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب و
تمدن کے اثرات بھی پھیلتے گئے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل بلوچستان
ایران اور زیادہ تر افغانستان کے زیر اثر تھا۔ فارسی بلوچستان کی سرکاری
اور تعلیمی زبان تھی مگر، انگریزی راج میں اردو زبان نے رفتہ رفتہ فارسی
کی جگہ لے لی۔ اس سے بلوچ شاعروں کے اشعار میں فارسی کے ساتھ
اردو کے الفاظ بھی شامل ہوتے رہے۔ بعض شاعر تو یہاں تک بڑھ گئے
اپنی نظموں میں جہاں کسی انگریز حاکم کا گفتہ بیان کرنا مقصود ہوتا اردو
میں اشعار پیش کئے۔ مثال کے طور پر جیسا کہ اخوند خان مجتبیٰ کی انگریزی
سپاہ کے خلاف لڑائی کی رزمیہ نظم میں شاعر کہتا ہے :۔

بہادر گوشہ انگریزی
مشتابی جنگ پردیزی
کہیری سوار دوڑایا
صاحب سے بات بولایا
پڑیا "میری[1] بدل" آیا
حکم یوں آپ فرمایا!
پکڑ لو، راہ د رستایا!

اُردو کو بلوچی بنانے کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ شعر کے معنی واضح
آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں شاعر کہتا ہے کہ:۔

[1] میری ڈیئر؛ انگریز جنرل۔

صاحب بہادر نے انگریزی میں کہا
لڑائی کے لئے جلد تیاری کرو
کہیریوں نے ایک سوار دوڑا کر
صاحب کو اطلاع دے دی۔
میری دیدر خود چڑھ کر آیا،
اور اُس نے حکم دیا کہ
تمام راستے روک لو،

یہی شاعر ایک اور جگہ کہتا ہے:۔

نہال درا کھان کا بیٹا
سروک ءَ بیتہ جہ گوٹ ءَ
گھزاءَ ما کنوں چھوٹا!

یعنی:۔

نہال ترکھان کا بیٹا
گاؤں سے لشکر کا سرغنہ بن کر نکلا
اُس نے کہا کہ ہم کافروں کے خلاف
ایک چھوٹا غزا[1] کریں گے،

[1] مذہبی جنگ، جہاد

انگریزوں کی آمد سے قبل، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں فارسی
ے الفاظ کثرت سے بلوچی شاعروں کی زبان میں راہ پا چکے تھے
وچ شعرا فارسی آمیز زبان کو شاعرانہ کمال، معراجِ سخن اور دانش
کمت کا مظہر سمجھتے تھے، بلوچی کے کئی ایسے شاعر جو فارسی میں
ھی شعر کہتے تھے، اپنی بلوچی نظموں میں بھی فارسی اشعار شامل

کردیا کرتے تھے جیسا کہ خان محراب خان کی شہادت کے متعلق اپنی بلوچی ...
میں ملا محمد حسن ریکسانی کہتا ہے :-

پہ شال کوٹ آہت و بوت جاہی
کتئ کاگھد پہ خان راہی
کنوں برخیز و بالا شو
بہ پیش شاہِ والا شو!

یعنی :- (انگریز) شالکوٹ (کوئٹہ) میں آکر مقیم ہوئے
یہاں سے انہوں نے خان کو خط لکھا،
اب اُٹھو، کھڑے ہو جاؤ۔
اور شاہِ والا تبار (شجاع الملک کے حضور میں
حاضر ہو جاؤ

خان میر محراب خان انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید
ہوئے۔ ملا محمد حسن کہتا ہے

ز پا افتاد شیر نر
رخش گردید مثل زر
نبوشید جام بے دردر
ز دست ساقیِ کوثر

یہ اشعار خالص فارسی زبان ہیں اور اس بلوچی نظم کے ہیں
ملا محمد حسن نے خان میر محراب خان کی شہادت پر کہی ہے۔ غرضیکہ
شعرائے متاخرین کی زبان خالص اور ٹھیٹھ بلوچی نہیں رہی تھی

میں زیادہ تر فارسی اور کمتر سندھی، اردو، سرائیکی اور براہوی زبانوں کی آمیزش ہونے لگی تھی، یہ آمیزش کیوں اور کیسے ہوئی۔ یہ موضوع اس وقت چونکہ ہمارے زیر بحث نہیں اس لئے تفصیلات میں ہم نہیں جاتے البتہ بلوچی رزمیہ شاعری میں جو نمایاں وضعی تبدیلیاں ہوئی ہیں اس پر قدرے تفصیل سے بحث کریں گے۔

بلوچی میں دوسری زبانوں کی آمیزش کے علاوہ رزمیہ شاعری میں دوسری بڑی تبدیلی یہ آئی کہ نظم کی براہ راست اور سادہ اشعار میں ابتدا کرنا جو شعرائے متقدمین کا خاصہ تھا، اب ترک ہو چکا تھا اور اس کے بجائے نظم کی ابتدا نعتیہ اشعار سے کی جاتی تھی، یہ غالباً اس لئے ہوا کہ بلوچی کے زنگی شاہی اور ڈوم شعرا کے بجائے اب لکھے پڑھے بلوچوں اور بالخصوص ملاؤں نے شعرگوئی شروع کی تھی، اس سے جہاں زبان آلودہ ہوئی وہاں شعر کی سلاست و فصاحت میں بھی فرق آگیا، اور شعر کی سطح گر گئی۔ ملاؤں نے مذہب کی طرح شاعری کو بھی اپنا آلہ کار بنایا اور اُسے ایک ایسے رنگ میں پیش کرنا شروع کیا جو متقدمین اور متوسطین کے دور کی شاعری سے مختلف، دقیق اور تقریباً بے جان تھی۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ اُس دور کے بلوچی شاعروں میں اکثریت ملاؤں کی تھی، بلکہ ملاؤں کو اس غرض کے لئے آمادہ اور تیار کیا جاتا تھا کہ وہ اس میدان میں زنگی شاہیوں کے نعم البدل بن جائیں بعض مشہور ملا شاعروں کے ناموں سے ہم واقف ہیں۔ مثلاً ملا بوہیر میرواڑی ملا بہادر مراستانی، ملا فاضل رند، ملا قاسم رند، ملا عبدالرحمان میرواڑی ملا ولی محمد میرواڑی، ملا یار محمد خارانی، ملا عبدالنبی، ملا بہرام، ملا ابراہیم

ملا عبد الصمد، ملا نور محمد بمپشتی، ملا رگھام دشتی اور ملا ہومر مری وغیرہ
اور ملاؤں کے نام گنوائے جاسکتے ہیں جو شاعر ہوتے کا دم بھرتے تھے
اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ملاؤں میں سے بعض بڑے اچھے
نامدار شاعر تھے لیکن اکثر مدح گو قسم کے زبان دراز ملا تھے۔ اگر غور سے
دیکھا جائے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دور ملاؤں کی شاعری کا دور تھا
ملا لکھے پڑھے اور محتاج لوگ تھے اس لئے بہت آسانی سے انگریز
سامراج کا آلہ کار بن سکتے تھے۔ ان کے مقابلے میں زنگی شاہی اور ڈوم
شاعر اور گوئیے پیشہ ور لوگ تھے، وہ سوائے اپنے قبیلے کے اور کسی
کے محتاج نہیں تھے، اپنے پیشہ سے گا بجا کر اپنی روزی کما سکتے تھے
اس کے علاوہ ملا مذہب کا مبلغ ہونے کی وجہ سے زیادہ کارآمد اور
با اثر تھا، جو بات وہ مذہبی رنگ میں کہتا، لوگ اُسے مان لیتے تھے
لیکن ڈوم اور زنگی شاہی شاعروں کو یہ مقام حاصل نہ تھا، ڈوم کا گوئیا
کہہ کر اس دور کے لوگ جو سرکار انگلشیہ کے زیر سایہ پرورش پا
رہے تھے، ان کے اشعار کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ مختصر الفاظ میں
یوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ صدیوں کی محنت سے زنگی شاہیوں نے جس بلوچی زبان
کی پرورش کی اور شاعری کو جو عروج بخشا۔ ملاؤں نے جلب منفعت کے لئے
اسے بام عروج سے فرش زمین پر گرادیا، یہی سامراج کی منشا تھی اور
ملاؤں کے ذریعے اُس نے حاصل کرلیا۔

بات بلوچی رزمیہ شاعری کے افتتاحیہ اشعار کی ہو رہی تھی شعرائے
متاخرین جن میں سے چند ایک کے علاوہ اکثر ملا اور لکھے پڑھے لوگ تھے
رزمیہ نظموں کی ابتداء نعتیہ اشعار سے کرنے لگے تھے، یہاں تک کہ رحم

بجار جیسا جادو بیان اور قوم و وطن دوست بلوچ شاعر بھی ان سے متاثر ہو چکا تھا، اس نے بھی انگریزوں کے خلاف مریوں کی رزم آرائی کی اپنی مشہور رزمیہ نظم کی ابتدا نعتیہ اشعار سے کی ہے، کہتا ہے:۔

الٰہی یا تئوں ستار
کریم و قادرو ڈاتار
صمد و قادر و جبّار
کَئے ءَ دیستہ تئی دیدار
مقام و دائمی دربار

یعنی:۔ یا الٰہی میں تجھے یاد کرتا ہوں کہ
تو ستار ہے
تو کریم اور قادر اور دینے والا (سخی) ہے
تو صمد، صادق اور جبّار ہے
کس نے تیرا دیدار کیا ہے
اور کس کو تیرے مقام اور ابدی دربار کا علم ہے

اسی طرح قلات کے نامی گرامی شاعر ملا محمد حسن رئیسانی بھی خان میر محراب خان کی شہادت سے متعلق اپنی نظم کی ابتدا اس طرح کرتا ہے:۔

صفت اوّل خداوند جہان ءَ
خداوند زمین و آسمان ءَ
ہزار صلوات نبی ءِ خاندان ءَ
محمد مصطفےٰ گوں چار یاران

شعر کی زبان اس قدر فارسی یا اردو آمیز ہے کہ ترجمے کی ز[illegible]
محسوس نہیں ہوتی۔

ایک اور شاعر ملا ہومر مری نے بھی گنبد کی لڑائی سے متعلق [illegible]
طویل رزمیہ نظم کہی ہے۔ اس کی ابتدا ملاحظہ ہو، کہتا ہے:-

صباہاں یات کنوں ستار
محمد مصطفےٰ دیندار
سخی و مومن و سچیار
خدا یکیں د تیں ڈاتار
حساباں باز نیں کار دار
جہانے خلق کنتی چو دھار
ہمو ساسی و دراہ ساہدار

یعنی:- علی الصبح میں خداوندِ ستار کو یاد کرتا ہوں
اور محمد مصطفےٰ جو دین کا رکھوالا ہے
سخی، مؤمن اور سچ بولنے والوں کا مددگار ہے
خدا ایک ہے اور وہی رزق دیتا ہے۔
اُس کے کاردار (فرشتے) بے حساب ہیں۔
وہ اس دنیا کا خالق ہے
تمام وحوش و طیور
اور دوسرے جتنے بھی جاندار ہیں
وہ ہی سب کا پیدا کرنے والا ہے۔

"کوش پروش" مکران کی لڑائی میر بلوچ خان نوشیروانی اور سردار محراب خان گچکی کی انگریزوں کے خلاف بلوچستان کی آزادی کی لڑائی تھی اس لڑائی سے متعلق مختلف شعرا نے رزمیہ نظمیں کہی ہیں سب شعرا نے افتتاح نعتیہ اشعار سے کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ اب شاعروں کو پسند آگیا تھا۔ اُن تمام شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ملک دینار میرواڑی کی نظم کا افتتاحیہ ملاحظہ ہو، کہتا ہے :۔

اچ تئی قدرتاں من لوٹاں یا رب انت امان
تو کریم ءُ شاہِ شاہان ءِ مہربان
صد ہزار عبرتاں گرین من، در یک زمان
باز من ءَ ارمان انت پرے بے سوہیں جہان

شیر و باشیران بارت، من حاکاں کنت نہان
پیل بنت مور و شیر بنت ردیا و رعیان

یعنی :۔ یاربّ! تیری قدرتِ کاملہ سے میں
امان چاہتا ہوں۔
تو کریم ہے
اور تو ہی بادشاہوں کا بادشاہ اور مہربان ہے
تیری قدرت کے ایک ہی کرشمے سے
ہمارے لئے عبرت پکڑنے کے صد ہزار مواقع
پیدا ہوتے ہیں۔

اس جہان فانی پر مجھے بہت افسوس آتا ہے کہ
بہادروں اور بزدلوں کو
ایک ہی طرح سے فنا کر کے مٹی میں چھپا دیتا ہے
اس کے دہان میں آکر
ہاتھی بظاہر چیونٹی اور شیر لومڑی بن جاتے ہیں۔

اٹھارہ سو عیسوی (۱۸۳۸ء) میں انگریزوں نے پہلی بار بلوچستان کی سرزمین پر قدم رکھا، اُن کا مقصد بلوچستان کو فتح کرنے کے بعد افغانستان پر دھاوا بولنا تھا، آرمی آف انڈس (ARMY OF INDUS) جب پہلی بار درہ بولان سے افغانستان کی طرف گذرنے کو آئی تو بلوچوں نے قدم قدم پر اُن کا مقابلہ کیا، آرمی آف انڈس کے بعض افیسر جنہوں نے اپنے روز نامچے لکھے، اور شائع کئے ہیں، اسے تسلیم کرتے ہیں کہ درہ بولان سے گذرتے وقت بلوچ مجاہدین کے حملوں سے انہیں سخت ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا، درہ بولان کی ہر چٹان کے نیچے اور ہر ہر موڑ پر انہیں انگریزی فوج کے سپاہیوں کی کٹی پھٹی اور پھولی ہوئی لاشیں پڑی ہوئی نظر آتی تھیں، مرے پڑے اونٹوں، گھوڑوں اور خچروں سے راستہ پٹا پڑا تھا، کوئی رات بلوچ مجاہدوں کے شبخونی حملوں سے خالی نہیں جاتی تھی اس طرح ہزاروں جانیں کھو کر آرمی آف انڈس بلوچستان سے گذر کر افغانستان کی حدود میں داخل ہوئی۔ اس سپاہ کو افغانستان میں جو پیش آیا وہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔

اگرچہ بلوچ شاعروں نے اُن واقعات کی طرف بھی بہت دلپذیر
ے کئے ہیں جن کو آگے چل کر موقع و محل کے مطابق ہم بیان کرینگے
دست بلوچی کے مشہور شاعر رحم علی بجار کی زبانی یہ کہنا کافی ہے کہ

شتہ جنگی دی قندہار ءَ
کتہ شہزادگان نعرا
دپانی چبو جتہ یار ءَ

(فرنگی، جنگ لڑنے کے ارادے سے قندہار گیا
قندہار کے شہزادوں نے اُسے للکارا۔
اور جوتی اس کے منہ پر دے ماری۔

قندہار سے منہ کی کھانے کے بعد جنرل ولشائر بے نیل و مرام
پس کوئٹہ پہنچا، یہاں پر حکومت برطانیہ کے نمائندے کی طرف سے
ے ہدایت ہوئی کہ قلات پر حملہ کرکے خان میر محراب خان کو کیفر کردار
ک پہنچادے جنرل ولشائر نے حکم کی تعمیل کی۔ خان میر محراب خان میدان
ن میں کام آئے۔ اور اُس کا محل (میری) انگریزی سپاہ کی لوٹ
کا تختہ مشق بنا رہا۔ یہ واقعہ ۱۸۳۹ء کو پیش آیا۔ بلوچ شاعروں نے
س واقعہ پر متعدد رزمیہ نظمیں کہی ہیں۔ جن میں سے چند ایک جو شعری
یت سے قابل ذکر ہیں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ اس سلسلے
پہلی رزمیہ نظم ملا محمد حسن رئیسانی نے کہی ہے۔

ملا محمد حسن بلوچی اور براہوی کے علاوہ فارسی کے بھی بڑے
شاعر تھے، اُس کی بلوچی فارسی آمیز ہے۔ افتتاح کے چند نعتیہ

اشعار کے بعد ملا محمد حسن کہتا ہے

شجا ول گوں پرنگی ءَ
نہ یک رنگ د درنگی ءَ
اَجا ہند ءَ رہے سند ءَ
جبرایش تت۔ پرے تران ءَ
روان مُلکِ خراسان ءَ
دیاں تخت ءَ شجاول ءَ
کشانی دشمن ءِ دل ءَ

یعنی:- شجاع الملک انگریزوں کے ساتھ
انگریز جو کہ دورنگے دھوکہ باز ہیں
ہندوستان سے سندھ کے راستے
(بلوچستان میں) آئے۔
بات یہ تھی اور اسی لئے وہ آئے تھے کہ
ہم مُلکِ خُراسان (افغانستان) جا کر
شجاع الملک کو تخت پر بٹھا دیں گے،
اور اُس کے دشمنوں کی جڑ نکال دیں گے

قندہار میں شکستِ فاش کھانے کے بعد جنرل ولشائر جب
واپس کوئٹہ پہنچا تو شاعر کہتا ہے:-

پہ شال کوٹ آ ہت و بوت جاہی
کتنگ کا گھد پہ خان راہی!

کنوں برخیستر و بالا شو
بہ پیش شاہ والا شو

یعنی:- جب وہ (دشمن) واپس کوئٹہ میں آکر مقیم ہوا۔
تو اُس نے خان کو خط بھیجا کہ
اب اُٹھو، کھڑے ہوجاؤ۔
اب شاہِ والا تبار کے حضور میں حاضر ہوجاؤ۔

خان میر محراب خان کو جب برنس (BURNUS) کا جو انگریزی سپاہ کا پولٹیکل افیسر تھا، یہ خط ملا تو اُس نے برنس کو تلخ جواب لکھ کر بھیجا جو بقول شاعر اس طرح تھا:-

بگو گشتہ شیر نر ہمچوش
تو برنیس برسرت کن ہوش
زیادہ پیش من مخروش
اُش آروچ مُرکہ بر تخت ءَ
نشتہ گوں وتی بخت ءَ
رسول اللہ گواہ اَستین!
من ءَ گوں کافر ءَ کستین!

یعنی:- (میر محراب خان) شیر نر نے اسطرح جواب دیا کہ
اَے برنس! اپنا ہوش سنبھال!
میرے سامنے زیادہ گستاخی نہ کر۔
جس دن سے اپنا نصیب لے کر

میں تخت پر بیٹھا ہوں،
رسول اللہ کی قسم کہ
کافروں سے میری دشمنی ہے

خان میر محراب خان کی طلبی کے اس مضمون کو ملا بوہیر بر وا
نے زیادہ بہتر طریقہ سے باندھا ہے، وہ کہتا ہے کہ:-

آ سگنت گنجین کلات ءَ باگچین شہر ءَ گور ءَ
ماگردن سیوائی تخت ءَ کوٹ و برزین جمبر ءَ
قاصدے ستا تگت جلدی لعینیں کافر ءَ
بیا تہ خان صاحب سلام کن شاہ ءِ بجلیں تپّر ءَ
گر نہیائیے ماکاؤں گوں فوج وگرانیں لشکر ءَ

یعنی:- جب وہ (انگریز) قلات کے باغوں والے شہر کے قریب آ
تو کہا کہ ہم سیوا کے تخت، قلعہ اور اونچے محل پر قبضہ کر لیں
تب اُن لعین کافروں نے بہت جلد ایک قاصد خان کے پا
روانہ کر دیا۔
اے خان! آجاؤ اور بادشاہ کے کلر نگ فرش پر
اُن کو سلام کرو۔
اور اگر تم نہیں آؤ گے
تو ہم خود بہت بڑی فوج اور لشکر
لے کر آئیں گے۔

مُلا بوہیر کا گفتہ شاعرانہ رنگین بیانی کے علاوہ تاریخی حقا

سے بھی زیادہ قریب ہے۔ میر محراب خان نے انگریزوں کو جو جواب دیا وہ بھی اس جیسے ایک نڈر اور بیباک بلوچ کے جذبات کی زیادہ بہتر ترجمانی کرتا ہے۔ بقولِ ملّا بوہیر:-

پُر دماگھ داتگ جواب سلطان سخی ئیں مُردرءَ
من ہما احمد زئیگان عیب داراں من سرءَ
نئے سلامت من کناں، نئیکہ دیاں ملک ءَ ترا
منتہت نیستن پہ جنگ ءَ حکم شاہین قادرءَ

یعنی:- اس سخی اور مردافگن سلطان نے غضبناک ہوکر جواب دیا۔
میں بھی اُن احمدزیوں میں سے ہوں
جو دشمن کے سامنے سر جھکانے کو عیب سمجھتے ہیں۔
نہ میں تیرے سلام کو آؤں گا
اور نہ ہی میں اپنا ملک تجھے دوں گا۔
اگر لڑنا ہے تو میں تمہاری منت نہیں کروں گا
جو خدا کا حکم ہے وہی ہوگا۔

دور متاخرین کی رزمیہ نظمیں جسقدر بھی فصیح و بلیغ ہوں متقدمین کی نظموں کے پایہ کو نہیں پہنچ سکتیں۔ رحم علی بجار کے سوائے اس دور کے باقی تمام شاعروں کی زبان ان کے مقابلہ میں خام بناوٹی، فارسی آمیز اور اس لیئے دقیق معلوم ہوتی ہے۔ ممدوح کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرنا اُن کے بس سے باہر معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ یہ شاعر خود مرد میدان نہیں تھے

لڑائی کا نقشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے میدانِ جنگ میں بنتا اور بگڑتا نظر تھا، وہ تو صرف سنی سنائی باتوں پر خیالی گھوڑے دوڑاتے تھے لیے زبان میں وہ تاثر پیدا نہیں کر پاتے تھے، جو ایک مردِ میدان کی زبان خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ شعرا فارسی اور عربی الفاظ کے سہارے بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو اکثر کامیاب نہیں ہوتی، لہٰذا ان کا واقعہ کا شعریت سے عاری ایک ایسا بیان بن جاتا ہے جو جذبات کو انگیختہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ملا محمد حسن کی اسی نظم کو لیجئے کہ جب انگریزوں کو جواب دینے کے بعد

کتیَ خان ءَ، ہمے تران ءَ
پہ تحقیق ءَ بہ دیوان ءَ
بیا داروغہِ دانا
بروگوں میر حسن خان ءَ
براھینگل ورخشان ءَ!
بگوشّ آزاتّ عباس ءَ
بیا جلدی ہمے پاس ءَ
مرو چی جنگ د نبگا ہی!
گوترآ انگریزءَ تنہائیُ
دّتی تخت ءِ سرءَ جاہی
کناں جنگے پہ دلواہی

یعنی:- خان نے با تحقیق مجلس میں یہ بات کی

اے دانا دار وغہ[1] اِدھر آ
اور میر حسن[2] خان کے ساتھ چلا جا
مینگل[3] اور رخشانی[4] قبائل کی طرف
اور عباس کے بیٹے آزاد خان[5] سے بھی جا کر کہدے کہ
جلدی اسی وقت آجا
آج انگریزی فوج وسپاہ کے خلاف لڑائی میں
میں اکیلا ہوں لیکن اس کے باوجود
اسے یقین جانو کہ اپنے تخت کے لئے
میں مردانہ وار لڑوں گا۔

خان میر محراب خان نے ایک اور قاصد۔ ملا محمد صدیق نامی کو زہری کے سردار میر رشید خان کے پاس روانہ کر دیا، اور اس سے بھی لشکرے کر آنے کی درخواست کی۔ مینگل شاہی زہی سردار کے علاوہ ان دنوں جھلاوان کے دوسرے سردار خان سے ناراض تھے، اس لئے بقول شاعر خان نے میر رشید خان کو پیغام کیا کہ:-

بگوتش میر رشید خان ءَ
مرد چی بیا بمیدان ءَ

---

[1] داروغہ گل محمد۔ [2] خان کا بیٹا جس نے بعد میں اپنا نام نصیر خان (دوم) رکھا۔ [3] نوشکی کے ذگر مینگل [4] نوشکی اور خاران کے قبائل۔ [5] خاران کا سردار آزاد خان نوشیروانی۔

گوں بنگاہ فوج دسامان ءَ
کوکت بو، گوں دتی خان ءَ

یعنی:۔
جا کر میر رشید خان سے کہدے کہ
آج (ذاتیات چھوڑ کر) میدان جنگ میں
فوج رسد اور سامان جنگ لے کر آجا،
اور اپنے خان کی مدد کر

رشید خان زرک زئی خان سے ناراض تھا، خان نے قادر بخش زہری کو قتل کیا تھا، رشید خان اس کا عوض کرنا چاہتا تھا، اگرچہ اس وقت جبکہ ایک بیرونی حملہ آور اس کے وطن اور قومی عزت و شرف پر دھاوا بول چکا تھا اُسے ذاتی رنجش کو قومی اور ملی معاملے پر ترجیح دینا نہیں چاہیئے تھا۔ اور شاید وہ ایسا نہ کرتے لیکن ملا محمد صدیق، جسے خان نے اپنا قاصد بنا کر اُس کے پاس بھیجا تھا، وہ خفیہ طور پر انگریزوں سے ملا ہوا غدار تھا۔ اس نے میر رشید خان کو ورغلایا، اور خان کی امداد سے باز رکھا، یہی حال خود ملا محمد حسن شاعر کا بھی تھا، اس لئے ملا محمد صدیق کے عیوب پر پردہ ڈالتے ہوئے کہتا ہے

رشید خان! ظاہرا زہر انت
گوشتی مرچی منی دار انت
من ءَ خان ءَ گوں چی کار انت
دتی وَت خان سردار انت

یعنی:۔
رشید خان نے

جو علے الاعلان خان کے خلاف تھا،
کہا کہ آج مجھے خان سے بدلہ لینے کا موقع ملا ہے
مجھے خان سے کوئی تعلق نہیں،
(خان کو سرداروں کی ضرورت نہیں)
وہ خود اپنا سردار ہے۔

الغرض میر ولی محمد خان مینگل اور میر عبدالکریم خان رئیسانی کے بغیر بلوچستان کا اور کوئی سردار میر محراب خان کی امداد کو نہیں پہنچ سکا۔ انگریز جنرل دلشائر بہت جلد قلات کے قریب پہنچ گیا، قلات سے بیس میل کے فاصلے پر زیارت کے مقام پر خان قلات کے لشکر اور انگریزی سپاہ کے درمیان پہلی مڈبھیڑ ہوئی۔ بلوچ لشکر شکست کھا کر قلات کے قلعہ میں محصور ہونے پر مجبور ہوا۔ جنرل دلشائر نے قلات کو گھیر لیا، دوسرے دن علے الصبح جنرل دلشائر نے قلعے پر دھاوا بول دیا، شاعر نے میدانِ جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے، کہتا ہے:-

برابر فوج ترّان ءَ
بہسل گاج گھڑّان ءَ
تپنگ و توپ ءِ دھنکارت
کلات من ددھوّان گارت

یعنی:- انگریزی فوج نے گھوم پھر کر حملہ کر دیا۔
بادلوں کی گرج کی طرح
توپ اور بندوقیں گونجنے لگیں،
قلات دھوئیں میں چھپ گیا۔

انگریزی سپاہ کا ایک دستہ ایک غدار کی رہنمائی میں
سے خان کے محل (میری) میں داخل ہوگیا، اور اُس مقام کو
کرلی۔ جہاں پر سے خان میر محراب خان اپنے معزز ساتھیوں
لشکر کی کمان کر رہا تھا، یہ دستہ خالص گورے سپاہیوں
یہاں پر جو دست بدست لڑائی ہوئی، اسے شاعر نے اس طرح

کُتہ خان اولی وارءَ
پہ تحقیق ءَ بہ کُفّارءَ
جہانے دلیتہ تلوارءَ
ز پا افتاد شیرِ نر
رُخش گردید مثلِ زر
بنوشید جام بے در در
زدستِ ساقی کوثر
بنوشید خان کوہستان
بفضلِ رحمتِ رحمان

یعنی ا۔
بے شک کر کُفار پر
پہلا وار خان نے کیا،
دُنیا نے اُس تلوار کی چمک دیکھ لی
پھر وہ شیر نر (میر محراب خان) گرا۔
اُس کا چہرہ چاندی کی طرح سفید ہوگیا۔
ساقی کوثر کے ہاتھوں کوہستان کے خان

وہ جام نوش کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اُس پر خدا کی رحمت ہو۔

شاعر نے نظم کے اختتام پر اُن جوانمردوں کے نام گنوائے ہیں جنہوں لڑائی میں خان میر محراب خان کے ساتھ اس مقام پر گورا سپاہیوں سے جام شہادت نوش کیا، کہتا ہے :۔

خبر اَستِن تن ءَ دسّ ءَ
کناں شاغاسی ءَ جسّ ءَ
جواھِر کرُتہ ناموس ءَ
امیر عبد الکریم خان ءَ
ہزار رحمت کہنت جوان ءَ
ولی محمد سپاری ءَ
پدا خان ءِ مزاری ءَ
شہید بُوت بے ہشیاری ءَ
بہ شہباز خان لہڑی ءَ
مُلّا فاضل محمد گون تت
سردپ دشمن ءِ خون تت
آ دیوان بچتہ بر دانش ءَ
دُنا کھیم چند و گورداس ءَ

جہاں تک مجھے معلوم ہے۔

شاغاسی تعریف کے لائق ہے

لے وزیر دربار۔

اں نے اپنے ناموس کو گوہر بنا دیا ہے
میر عبدالکریم خان زرمیسانی کی تعریف کرتا ہوں
اس جوان پر ہزار رحمت ہو۔
میر ولی محمد (مینگل) جو ایک راستباز شخص تھا
شیر کی طرح لڑتے ہوئے
خان کے بعد شہید ہوا۔
شہباز خان لہڑی کے ساتھ
ملا فاضل محمد بھی لڑائی میں شامل تھا،
ان کے ہاتھوں دشمن کے منہ سے خون بہہ رہا تھا
دیوان بچہ، سیر داس
کھیم چند اور گوردا س بھی
قابل ستائش ہیں۔

ملا محمد حسن کی نظم جیسا کہ اقتباسات سے ظاہر ہے اگرچہ چست اور رواں بحر میں ہے لیکن اس میں رزمیہ کی وہ شان اور کڑک نہیں جو دور متقدمین کے شعراء کے کلام میں اور متوسطین میں بالاچ کی قومی اور جنگی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ جزئیات کے بیان میں بھی ملا محمد حسن اُن کے پایہ کا شاعر نہیں۔ البتہ ملا بوہیر میر داڑی نے اسی لڑائی سے متعلق ایک طویل بحر میں جو رزمیہ کہی ہے وہ بھی اگرچہ ملا محمد حسن کی نظم کی طرح فارسی الفاظ و اشعار کی آمیزش سے مکدر ہے۔ لیکن شوکت لفظی، رنگین بیانی اور اثر انگیزی میں قابل قدر ہے۔ اس نے خان میر محراب خان اور انگریزی سپاہ کی مڈبھیڑ، دست بدست لڑائی اور خان کی شہادت کا بیان

زیادہ بہتر طور پر کیا ہے۔ کہتا ہے:-

جیہری گھونبار د توپان یک دمانے گھڑتگ !
قلعہ ءِ بادگیرءَ تگہاڑین یک سرگیش ژند کتگ ۔
گپتگنتش برُج و بادگیر، جنگِ شاہی تچتگ
پہ گھزب سلطان فرین شاہءَ پہ ہیبت گھرتگ
ھلّیے سنجاب شاہی، تاج وزیور پوشتگ
گپتگی اسپر نگارین ذوالفقاری ہر جتگ !
ھکّل و ہیبت کنان ءَ چو علیؓ ءِ زور کتگ !

موسلا دھار مینہ برسانے والے بادلوں کی طرح
غبارے اور توپ گرجنے لگے،
محل اور قلعہ نما بادگیر پہ دشمن نے قبضہ کرلیا۔
شاہانہ لڑائی مچ گئی۔
سلطانی شان وشوکت رکھنے والا خان
غضب میں آکر غرانے لگا۔
اُس نے سنجاب کا شاہی لباس تاج اور زیور پہن لئے تھے
چٹان جیسی ڈھال کو ہاتھ میں لے کر تلوار کھینچ لی۔
اور یا علیؓ کا نعرہ لگاتا ہوا۔
دشمن پر ٹوٹ پڑا

شاعر نے اپنی طرف سے منظر کشی میں کوتاہی نہیں کی ہے، مگر چونکہ صحیح حالات سے باخبر نہیں تھا اور نہ ہی اُس نے میدان جنگ میں

کبھی جوانمردوں کے حملے کا سماں دیکھا تھا، اس لئے خان کو تاج، شاہی لباس اور زیور پہنا کر میدان کارزار میں بھیجتا ہے۔ متاخر دور کے گلا شاعروں کی رزمیہ نظموں میں اس قسم کی خامیاں پائی جاتی ہیں بہرحال خان میدان جنگ میں اکیلے نہیں تھے، اُن کے ساتھ کئی دوسرے سرفروش بلوچ بھی اپنی شجاعت کا جوہر دکھلانے کیلئے موجود تھے، ان کے نام گنواتے ہوئے ملا بوہیر کہتا ہے:۔

گون اُتی چندی مڑد کین مرد، سازین سیاہ جگر
تیگھ زنین عبد الکریم د تاج محمد شیر نر
میر ولی محمد نہنگین مینگلانی تاج و سر
شیر محمد، میر کمال خان، سرفرازیں سیاہ جگر
نور محمد سرمچارین، زیب رو ستم، نامور
ہندوئے بچل مزارین تو کلش گُرتگ اَثر
یکز دش گرتنت تپانچ و تیگھ الماسیں تبر
شاہ پیران یات کنگ یا غوث اعظم مستمر

یعنی:۔
کئی سیاہ جگر (بہادر) مسلح اور لڑاکے جوانمرد ان کے ساتھ تھے۔
جن میں شمشیرزن عبد الکریم (رئیسانی)
اور شیر نر تاج محمد (شاہوانی) بھی تھے۔
نہنگ کیطرح خونخوار، مینگلوں کا سردار
ولی محمد بھی تھا،

شیر محمد اور میر کمال خان جیسے سرفراز و بہادر بھی تھے۔

اپنے سر کی پرواہ نہ کرنے والا

اور رستم کی طرح نامور نور محمد بھی تھا۔

شیر جیسا بہادر ہندو دیوان بچل بھی تھا۔

جس کی توکل کا اثر سب پر پڑا تھا،

ان بہادروں نے پہلے طپانچے چلائے اور پھر

تلواریں اور الماسی تبر سونت کر،

اور پیروں کے بادشاہ غوث الاعظمؒ کو یاد کر کے

دشمن پر حملہ کر دیا۔

شاعر نے ان جوانمردوں کے، جن کے نام گنوائے ہیں ہر ایک کے لڑنے اور جام شہادت نوش کرنے کا جدا جدا بیان بھی کیا ہے۔ جو بلوچی رزمیہ شاعری کا ایک مسلمہ دستور ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

ایک دمانے لکھّ خراجی دڑّی گوترّ تنت و دھڑی

خنجر دیگھاں جڑ بنتنت خان کپتین پہ پڑی!

تیگھ زنین عبدالکریم و تاج محمد ماٹری

میر ولی محمد ہنگین کپت مزاری دکھڑی

شیر محمد، میر کمال خان، جہل شتنت چہ مرکبان

نور محمد سر مچارین ھدری گت گوں منگہان

ہندوئے بچل تہ پھر بیرت سر وتی چہ کنوّان

گوں دتی خان ءَ شہید بو تنت گوادمن دشتران

یعنی:۔

تھوڑی دیر تک

لاکھوں کے خراج کے عوض میں حاصل کی ہوئی

توپوں اور بندوقوں نے گرم اولے برسائے

پھر خنجر اور تلواریں لپکیں، اور

خان (محراب خان) میدان میں گرے

شمشیر زن عبدالکریم، تاج محمد اور نہنگ صفت میر ولی محمد

شیر کی طرح لڑتے ہوئے زخم کھا کر گرے،

میر کمال خان اور شیر محمد بھی مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوئے

سرفروش نور محمد بھی جھپٹ کر بہادروں کے ساتھ جاملا.

(دیوان) بچل ہندو نے بھی

تلواروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا سر کٹا دیا۔

یہ سب بہادر،

تاریخ کی کتابوں میں جن کا ذکر موجود ہے

اپنے خان کے ساتھ شہید ہوئے

متقدمین اور کسی حد تک متوسط دور کے شعرا کے رزمیہ کلام میں جو سلاست، سادگی اور تاثر پایا جاتا ہے وہ دور متاخر کے شعرا کے کلام میں نہیں ملتا، ان میں شاعرانہ رنگین بیانی تو ہوتی ہے لیکن فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ کے استعمال اور بندشوں سے عام بلوچ سامع اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، ایسا لگتا ہے کہ اس دور کے شعرا عوام الناس کے لئے نہیں کہتے تھے، بلکہ ان کے پیش نظر بلوچوں کا ایک خاص طبقہ

..جن کی شبینہ مجلسوں میں بیٹھ کر وہ تحت اللفظ اپنے اشعار سناتے
..عام پاتے تھے۔ اس لئے بلوچی شاعری کی عام روایات سے ہٹ کر اپنے
..کو خوش کرنے کیلئے وہ مبالغہ آرائی کیا کرتے تھے۔ نفس مضمون کے
.. فارسی اور عربی کے مشکل اور ثقیل الفاظ کے استعمال کی طرف زیادہ
..دیتے تھے، اس کی ایک بہترین مثال ملا بوھیر میرواڑی کی اس رزمیہ
..میں ملتی ہے جو اس نے خان میر محراب خان کی شہادت پر کہی ہے
..میں خان میر محراب خان کی مدح میں کہتا ہے۔

باگھہین سیوا کلات ءُ نشتگت عالی جناب!
شاہ فرد شاہزادگ و سلطان، نوابین شیخ و شاب
زیب کاؤس، شاہ چرخ و شاہ فرد رستم رکاب!
مجلس ءِ دعا مُوردائمُ، خان بہ کُرسی دتناب
خلقتے مان پوشہیت سنجاب شاہی بے حساب
چو شاہ سلطان سکندر پہ عروسی کامیاب
عاقل و دانا و میران، ہم چو مثل آفتاب
مسندِ شاہی زرافشان، سرخ و سرخ زرنگار
ہند و سندھ ءِ گنج و دانا اچ گیاہین قندہار
ملکِ ایران، چین و ماچین، مصر شام و سرد یار
زندا کنت اچ ترسِ خان ءَ ہم چو شیران در شکار
نشتگت محراب نوابین زحم جن و عالی تبار
عادلین نوشیروان و شاہ جمشید تاجدار

وہ سلطان عالی جناب
سیرا کے باغوں والے قلات میں تشریف فرما تھے
اُن کے گرد بادشاہ اور شہزادے
نواب اور شیخ و شاب حلقہ باندھے کھڑے رہتے تھے
وہ زیب کا ذس، دنیا کا بادشاہ اور ایسے عظیم الشان تھے
کہ رستم اُن کی رکاب پکڑ کر چلے
اُس خان کی مجلس میں
مامورین حکومت مدام کرسیوں پر بیٹھا کرتے تھے۔
اور وہ اُن کو مخمل و شاہی سنجاب کی خلعتیں دیا کرتے تھے۔
وہ سلطان سکندر کی طرح کے ایک کامیاب حکمران تھے۔
اُن کے دبیر و مشیر عاقل و دانا اور مثلِ آفتاب روشن ضمیر تھے
اُن کی مسندِ شاہی،
سونے چاندی سے سُرخ اور زر افشاں تھی۔
ہند و سندھ کی دولت اور قندھار کے دانا اُسکے دربار میں تھے
ایران، چین و ماچین، مصر اور شام
غرضیکہ ہر ملک کے بادشاہ اس خان کے ڈر سے
ایسے سہمے ہوئے رہتے تھے، جیساکہ
شیر سے شکار سہم جاتا ہے۔
وہ شمشیر زن اور عالی تبار نواب محراب خان
اپنے تخت پر نوشیروان عادل

ملہ ہند چینی و غیرہ

اور جمشید بادشاہ کی طرح جلوہ افروز تھے۔

رف مُلا بوہیر ہی نہیں، بلکہ اس دور کے تمام بڑے بڑے شعرا جیساکہ مُلا
ل رند، ملا قاسم رند، ملا بہادر مَراستانی، ملا عبدالرحمان میروادی، مُلا
بی اور ملا یار محمد رخشانی وغیرہ اسی طرزِ بیان کے شیدائی اور پیروکار تھے
ر شاعری میں تو اس مشکل طرازی، مبالغہ آرائی اور غُلو کی گنجائش نکل سکتی
، لیکن رزمیہ میں بلوچ اسے پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ اس سے واقعہ نگاری
صداقت مجروح ہو جاتی ہے۔

انگریزوں کی ہند و سندھ اور بلوچستان میں آمد سے متعلق ملا بوہیر نے
و اشعار کہے ہیں اُن کا مطلب آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس دور کے
احب فن شعرا میں سے اکثر اسی کوشش میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں کہ ان کی زبان
نکلے جو اشعار نکلیں وہ اتنے مشکل اور دقیق ہوں کہ عام آدمی کی سمجھ میں
سانی سے نہ آ سکیں اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ شعر کہتے وقت
اعر کے دل و دماغ پر یہ خوف طاری رہتا ہو گا کہ اس کے اشعار سے اگر عوام میں
شتعال پھیل گیا تو صاحب لوگ (انگریز) ناراض ہو جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ
شاعر سامعین پر اپنے کمالِ فن کا رعب بٹھانا چاہتا تھا۔ مثال کے طور پر
ملا بوہیر کی اسی رزمیہ نظم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں کہتا ہے:-

گنگنت بُومبادُ ملا ہین، غم زوی، بے حاصلین
کلکتہ تا حدِ لندن، فوجی گون انت مشکلین!
من کردی چیل جنگی گون آتنت بے مُہولین
قُلش کرتنت مرد دتریان، زحم جنین ورنا بلین

لوٹ مار مچی ہوئی ہے

یعنی :- غم کے مارے لوگ ان سے مقابلے کی بے حاصل کوشش

وہ (انگریز) لندن اور کلکتے کی حدود سے آئے

اور بہت بڑی فوج ان کے ساتھ تھی۔

جس کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔

بے شمار فیلان جنگی بھی ان کے ساتھ تھے،

جن پر ہودے مرغ کے تاج جیسے لگتے تھے۔

اور وہ گھوڑں، جوانمردوں اور شمشیر زن نوجوانوں کو

قتل کیا کرتے تھے۔

ان اشعار کے ترجمے سے تو بلاشبہ ان کی ثقالت کا پتہ نہیں لگ ر

لیکن اصل بلوچی پر غور کرنے سے قاری کو اس کا ادراک ہو سکتا ہے کہ شا

بات بنانے کیلئے کیسے کیسے پاپڑ بیلے، اور مشکل الفاظ و بندشوں کا سہارا

اس سلسلے کی دوسری رزمیہ نظم ملا یار محمد رخشانی کی ہے جس میں انہ

نصیر خان دوم کے خاران جانے اور وہاں سے سردار آزاد خان نوشیروانی

لینے اور قلات پر بلوچوں کے حملہ کا ذکر کیا ہے۔

خان میر محراب خان کو جب انگریزوں کے قلات پر حملے کی تیاریوں

ہوا تو اس نے داروغہ گل محمد کو اپنے بیٹے میر حسن خان کے ساتھ جو بعد میں میر

دوم کے نام سے تخت نشین ہوا، مینگلوں اور رخشانیوں کی امداد حاصل کر

روانہ کیا، نوشکی سے مینگلوں کا لشکر لے کر نصیر خان اسی دن واپس جب

پر پہنچا، جس دن میر محراب خان کو شہید کر کے انگریزوں نے قلات پر قب

تھا. اگرچہ نصیرخان مینگلوں کے اس مختصر لشکر کے ساتھ جن کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی قلات پر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن داروغہ گل محمد نے اُسے روک دیا. کہ اس سے سوائے اتلاف جان کے اور کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا داروغہ گل محمد کے مشورے پر عمل کرکے نصیرخان چھپڑ سے واپس نوشکی پہنچا اور وہاں سے مینگلوں کے ایک دستے کے ساتھ سردار آزاد خان نوشیروانی کے پاس امداد حاصل کرنے کیلئے خاران چلا گیا، مُلّا یار محمد کی یہ نظم اسی واقعہ کے بیان میں ہے:-

انگریز بلوچستان میں کیسے آئے؟ مُلّا یار محمد نے اِسے اسطرح بیان کیا ہے

لشکرے زرتہ سجاول گوں پرنگ دکافران
کلکتہ تا حدِّ لندن بُت پرستین ملحدان
آتکگنت ہاری ملان ءَ ہچو دریائی مجان
اَچ حساب دداءَ گیشہت، گپتہ سندھ ٹالپران
کچھی ءَ گوئر موش دیان بُت چونہ گوئرتین حمران
ساؤنڑی ترنیان رچان ءَ گوشتہ کوہ دسرشمان
گلزمین پرچنڈگ ءَ ثت، آسوتیں پہ لرزگان
با روزیان تاپ نہیادرث ہچ زمان اچ لشکران
خان شہید بیگ گون بیلاں میر محراب خان دُرّ بیان
پت چہ چکاں بے خیال تت، مات ہزاری دحکان
کابل ءَ تان قندہار ءَ کرتگنت آخر زمان

یعنی ا۔ شجاع الملک نے فرنگی کافروں کا لشکر ساتھ لیا۔

فرنگی جو کافر اور مُلحد ہیں۔

اور جو لندن سے کلکتہ کی حدود میں آئے تھے،
وہ (فرنگی) ایسے آئے جیسے دریا میں طغیانی آتی ہے
اُن کی تعداد حساب سے زیادہ تھی۔

سندھ کے ٹالپر (امیروں کو) انہوں نے گرفتار کر لیا۔
اور پھر اُن گھٹاؤں کی طرح جواب تک نہ برسی ہوں،
کچھی کو چھاتی کے نیچے مسلتے ہوئے آگے بڑھے،
اور ساون کے بادلوں کی طرح مینہ کی جھڑی لگاتے
پہاڑوں اور گھاٹیوں پر سے گذرے۔

زمین کانپ اٹھی اور سہیل کا ستارہ لرزنے لگا۔
(سبی کے) بارکزئی اُن کی لڑائی کی تاب نہ لا سکے،
اُن کے لشکر کے سامنے نہیں ٹھہر سکے،

خان، میر محراب خان،
جن کے بیان میں میں موتیوں کی لڑیاں پرونا چاہتا ہوں
اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہید ہوئے۔
(قلات کی) حالت ایسی ہوئی کہ
باپ کو بیٹوں اور ماں کو بیٹیوں کا خیال نہ رہا۔
قندہار سے لیکر کابل تک
انہوں (انگریزوں) نے ایک محشر بپا کر دیا۔

سردار آزاد خان نوشیروانی نے ایک بہادر بلوچ کی طرح میر نصیر خان

ش آمدید کہا اور انگریزوں کے خلاف اسکی امداد پر کمربستہ ہوگیا۔ ملا یار محمد
ی سردار آزاد خان کے اس فیصلے پر پہنچنے کا بیان اس طرح کرتا ہے:۔

گوشتہ آزات خان بلوچ ءُ چو پرا شیرین زبان!
پجروں ایشں اِنت مں جہان ءُ جنگنت مئے گوں کافران
یاقیوم اللہ مدت بُو دوستیئی پیغمبران
دُنیا فانی و فنا انت، عاقبت روچے مران!
محراب خان ءِ بچ اِنت اتکہ، است مں ءِ پہ دیگان

آزاد خان بلوچ نے میٹھی زبان سے کہا!
اس دنیا میں میری بس یہی ایک خواہش ہے کہ
کافروں سے جنگ کروں۔
خداوند قیوم، اپنے پیغمبروں کے طفیل
اس جنگ میں میری مدد کردے
یہ دنیا فانی اور فنا ہونے والی ہے۔
آخر ایک دن مجھے بھی مرنا ہے۔
آج محراب خان کا بیٹا میرے پاس آیا ہے۔
اُس کی مدد کرنا،
مجھے سر آنکھوں پر منظور ہے۔

اس نظم میں ملا یار محمد نے آگے چل کر اپنا تمام زور بیان سردار آزاد خان
کی لڑائی کے لیے تیاری، ہتھیاروں کی سج دھج، پوشاک اور گھوڑے کی

تعریف پر صرف کیا ہے، اور اس میں اس حد تک آگے بڑھ گیا ہے کہ غلو، اور اشتباہ کی حدیں بھی پھلانگ چکا ہے۔ یہ انداز بیان متقدمین اور متوسطین کے دور کے رزمیہ کلام کے رائج اصولوں کے خلاف ہے۔ لیکن متاخرین نے اس انداز بیان کو بڑھ چڑھ کر اختیار کیا ہے۔ اور اُسے مبالغہ آرائی اور غلط بیانی کی انتہائی حدود تک پہنچا دیا ہے۔ اس سے بلوچی رزمیہ کی وہ اثر انگیزی، اور سلاست جو اس کا خاصہ تھا کمزور بلکہ مفقود ہو چکی ہے۔ ملاّ یار محمد نے یہ نظم کہہ کر سردار آزاد خان کی مدح میں الفاظ کے جو گوہر پروئے ہیں اُن سے نظم میں رنگینی اور شوکت لفظی پیدا ضرور ہوئی ہے۔ لیکن رزم جوئی اور سرفروشی کا تاثر کمزور پڑ گیا ہے۔ بلوچی رزمیہ نظمیں اس لئے نہیں کہی جاتی تھیں۔ کہ اُن سے بہادروں، جان نثاروں اور لڑائی کے سرغنوں کی ہی تعریف ہو یا بھگوڑوں، بزدلوں اور غداروں کی ہجو ہو بلکہ اُن سے ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ آئندہ نسلوں کے لئے تاریخی سچائی کو محفوظ رکھا جائے جو نوجوان نسل کے دلوں کو اُن کے آباؤ اجداد اور قومی مشاہیر کے بہادرانہ کردار سے مدام گرماتی رہا کرے، دور متاخر کے شعراء نے جب ان مسلمہ تقاضاؤں کو پس پشت ڈال دیا اور محض مدح گوئی کو شعار بنا لیا، تو ان کی رزمیہ گوئی کی یہ حالت ہوئی جیسے کسی دکان کے شوکیس میں استادہ بت کو ریشمی ملبوسات اور ہیرے اور جواہرات سے لدا پھندا رکھ دیا جائے۔

ملاّ یار محمد، سردار آزاد خان کی جنگ کے لئے تیاریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

براشارت گوُشت بلندبخت ءُگوں حاصین کوکرءَ
بیار منی جوانیں سلاحاں، اسپ تازی گردجکرءَ

تیکھ سپاہانی بروکین، گوں شروکین اسپرءَ
کارچ و کاٹار و تاس ءَ گوں جلوہ ناکین خنجرءَ
ھل پوشان منے گہنیاں، زیب گوں سہوین کیگان !
اسپرءَ کوچ ءِ شروکین، برمش چو باہے چاردہان
زیب ءَ نقشِ پرنگی، گرتند کنت چو کہکران
کارسیمی اش اُردسی پادان گرگنگ موزگان
بسم اللہ، نام اللہ، درسی گرگنگ قفلِ جان !
دُلدُل ءَ علگہ کنوکین، نامی پُرشتہ درجہان
دُرشتگ پہ پُٹ و ڈنان، لگتگ پہ فرفران
جہل چہ سُرنبان سراپ کنان مُنت برزچہ بیلی مُندران
گردن دگنری کپل پردش گوں چکھینین تورگان
زہر گیپت سردار سنجی ءَ ین، پہ کیب بوتہ روان
بے نیازی سوار بوتہ میر اصیلین گرد صبرءَ
پادی گواز نیت من رکاب ءَ پرشیتہ رخش ءِ گوگ ءَ
مسک چنڈ نیت ترھڈ کناں انت، جنت زاسکی گمیدان
بل دیا زیگر تجو کین، ہردگپتت پنجگان !

اس بلند بخت والے (آزاد خان) نے
اپنے خاص نوکر کو اشارہ کرکے کہا
میرے اچھے اسلحہ جنگ
میرا تیز دوڑنے والا گھوڑا،

میری تیز دھار والی اصفہانی تلوار
میری چمکیلی ڈھال اور چھُرا
میری کٹار، طپانچہ اور تابدار خنجر لے آ۔
پھر اُس نے اپنے پہننے کا عمدہ زرہ بکتر
جو سرخ رنگ کے کیسوں کے ساتھ اچھا لگتا تھا،
پہن لیا،
ڈھال جو چودھویں کے چاند کی طرح چمکتی تھی
اپنی پشت پر ڈال دی۔
اپنی بندوق جو فرنگستان کی بنی ہوئی ہے۔
اور بادلوں کی طرح کڑکتی ہے۔ اٹھائی۔
اپنے وہ موزے جو روس کے بنے ہوئے تھے،
اور جن پر ریشمیں کام ہوا تھا، پہن لئے۔
پھر اس نے بسم اللہ جو اللہ کا نام ہے
پڑھ کر اپنا قفلِ جان کیا۔
اب نوکر اُس کا گھوڑا لایا۔
جو دُلدُل کی طرح تیز دوڑنے والا تھا،
اور جس کا نام دنیا میں مشہور تھا
اور جو میدانوں اور پتھریلی وادیوں میں
فراٹے بھرنے لگتا،
تو اُس کے سُموں کے نیچے سے
روڑے، کنکر، اُڑ اُڑ کر دُور جا پڑتے تھے۔

اس کی موٹی گردن، بل کھائی ہوئی
اور ایال لمبے اور خوبصورت تھے۔
اُس کو دانہ کھلانے کا توبرہ منقش تھا،
وہ سردار جو سخی تھا اور جو اُس وقت غضب ناک ہو گیا تھا
ایک عجیب شان سے
اپنے اُس فرشتہ صفت گھوڑے کی طرف چلا
جو رخش[1] کے بچھیرے کی مانند تھا۔
رکاب میں پاؤں ڈال کر
وہ، اس فرشتہ صفت رخش کے بچھیرے کی پشت پر بیٹھ گیا۔
ایک ہاتھ میں اس نے نیزہ سنبھالا۔
اور دوسرے میں اسپ بازیگر کی باگ پکڑلی۔
گھوڑا، ہرن کی طرح
اچھلتا، کودتا اور چھلانگیں لگاتا ہوا، چل پڑا۔

اسی لڑائی سے متعلق ملک دینار میر داڑی نے بھی ایک رزمیہ نظم کہی ہے۔ ملک دینار نے میر نصیر خان کی لڑائی کے لئے تیاری اور لشکر کشی کا بیان ایک دلکش پیرایے میں کیا ہے۔ بحر بھی رزمیہ اور رواں ہے کہتا ہے:-

سلطان چو سکندر ز بیلاد
جمشید و ہمایون اِسرار
خان برد بعبر ئو بستہ سوار
فوج د لشکرٔ کرتہ تیار
مرد و مرگیاں نیست اَشمار!

[1] رخش رستم کے گھوڑے کا نام

آسمان و زمین دھنزاں تھار
تو پنت دجزارؔ بسیار
طبل تنت دطبل بازاں سار
رستنت ساوڑی مثل ہار

یعنی

سلطان (نصیر خان) جو سکندر کی طرح خوبرو
اور جمشید و ہمایون کی طرح صاحب بصیرت
اپنے دلبر نامی گھوڑے پر سوار ہوئے
اپنی فوج اور لشکر کو تیار کیا،
اس کے لشکریوں اور گھوڑوں کا شمار نہیں،
اُن کی گرد و غبار سے
آسمان اور زمین پر اندھیرا چھا گیا۔
اُن کے پاس بہت سی توپیں اور جزار تھے
طبل جنگ اور طبل بازوں کی لمبی قطاریں تھیں
وہ ساون کی بارشوں سے
اُٹھنے والی طغیانی کی طرح چڑھ کر بڑھنے لگے

ملا یار محمد نے اپنے ممدوح سردار آزاد خان نوشیروانی
ستائیں جو جولانی طبع دکھلائی ہے۔ میدان جنگ کا نقشہ کھینچنے
کی کیفیت بیان کرنے میں ویسی جولانی نہیں دکھلا سکا ہے۔ قلات
نصیر خان کی زیر کمان بلوچوں کی یلغار اور انگریزی سپاہ کے خلاف
بے نظیر سرفروشی اور رزم آرائی کا ذکر صرف چار بند میں کیا

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور کے عام مُلّا شاعروں کی طرح چھوڑ دیا ہے، اُسے بھی بذاتِ خود کبھی میدانِ جنگ کا نظارہ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے،

کہتا ہے:۔

اُتُگگنت چو ہوا و گوات ءَ بر کلاتی چمبران
دُھوت و دھنز بوت و گھبار اچ توپکانی دھشتان
روشنیں روچ چو شپ ءَ بوت بازیں توپ ءِ ہکلان
تخت سیواءَ بگپتنت ہچو عالی در زمان

یعنی:۔

وہ طوفانی ہوا اور بارش کی طرح
قلات کے قلعہ کے سامنے پہنچے،
بندوقوں کے دھماکوں سے
دھواں اور گرد و غبار چھا گیا،
توپوں کی گھن گرج سے
روزِ روشن رات کی تاریکی میں بدل گیا،
اور انہوں نے علیؓ کی طرح
آن کی آن میں سیوا کے قلعے (قلات) پر قبضہ کر لیا۔

نصیر خان نے چار ہزار بلوچ لشکر کے ساتھ یکم اگست ۱۸۴۰ء کو قلات پر حملہ کر کے بزورِ شمشیر اس پر قبضہ کر لیا، میجر لوڈے (LOVEDAY) جو بوچوں میں لبدین کے نام سے مشہور ہے اور جو انگریزوں کی طرف سے ایک دستہ سپاہ کے ساتھ قلات کی حکومت پر مامور تھا، گرفتار ہو گیا۔ بعد ازاں ڈھاڈر کے مقام پر قاسو نامی ایک بلوچ نے جو اس پر نگران تھا

تھا، اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا، میر محراب خان کا بیٹا میر حسن خان نصیر خان
دوم کے نام سے قلات کے تخت پر بیٹھا۔

بلوچوں نے ازاں بعد میر نصیر خان دوم کی سرکردگی میں سراوان
اور کچھی کے میدانوں میں انگریزوں کے خلاف متعدد لڑائیاں لڑیں، یہاں تک
کہ انگریز پسپا ہو کر سندھ کی سرحد شکار پور تک پیچھے ہٹ گئے۔

بلوچوں نے انگریزوں کو آسانی سے اپنے ملک پر قبضہ کرنے نہیں دیا
بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انگریزوں نے فوجی طاقت سے بلوچوں کو زیر کر کے
کے وطن کو کبھی فتح نہیں کیا، بلوچ قبائلی سرداروں کی باہمی رقابتیں اور
خان قلات اور سرداروں کے اختلافات، لڑائیاں اور لوٹ مار کے
اور غیر اختتام پذیر واقعات نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ انگریزی حکومت
کے نمائندے کو واحد ثالث کی حیثیت سے اپنے درمیان قبول کریں۔ اس
میں کوئی شک نہیں کہ بلوچوں میں افراتفری پھیلانے اور باہمی اختلافات کی
خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں پس پردہ انگریزوں کا ہی ہاتھ تھا
خان قلات اور قبائلی سرداروں کی غیر دانشمندانہ حرکتیں بھی دخیل تھیں
جس سے انگریز شاطروں نے جی بھر کر فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ۱۸۷۶ء
میں اُن کے اپنے دستخطوں سے بلا جبر و اکراہ اُن سے بلوچستان کا قبضہ
حاصل کر لیا۔

بہرحال بلوچوں نے سندھ اور پنجاب میں بھی انگریزوں کو چین سے
بیٹھنے نہیں دیا۔ سرحدات پر آئے دن انگریزی چھاؤنیوں پر بلوچ حملے کرتے
رہے۔ چھاپے مارتے اور چھوٹی موٹی لڑائیاں لڑتے رہے۔ چھاپہ کی

لڑائی میں بلوچ زمانہ قدیم سے ماہر جانے جاتے تھے، سندھ اور پنجاب کی سرحد پر چھاپہ کی لڑائیوں میں اُڑند خان نامی ایک بگٹی نے بڑا نام پیدا کیا، اڑند خان قبیلہ بگٹی کے فیروزانی نوتانی طائفے سے تھا، ایک دفعہ اڑند خان نے پانچ سو سوار و پیادہ بگٹیوں کا لشکر لے کر انگریزوں کی ایک سرحدی چھاؤنی پر چھاپہ مارا۔ ان دنوں "میری ویدر" نامی ایک انگریز افسر جو بعد میں بلوچستان کے معاملات میں بہت مشہور ہوئے اپنے رسالے کے ساتھ شاہ پور میں مقیم تھا، کھیری بلوچوں نے جو بگٹیوں کے خلاف اور انگریزوں کے طرفدار تھے، "میری ویدر" کو فوراً اطلاع پہنچا دی۔ میری ویدر اپنا رسالہ لے کر اڑند خان کے تعاقب میں نکلا۔ اور ہوتی کے مقام پر اُسے جا لیا، شدید لڑائی ہوئی۔ جس میں اڑند خان اپنے تین سو ساتھیوں سمیت میدان جنگ میں کام آیا۔

اڑند خان بگٹی اور میری ویدر انگریز کے درمیان یہ لڑائی سنہ ۱۸۴۵ء میں لڑی گئی۔ اس لڑائی سے متعلق جس شاعر نے رزمیہ نظم کہی ہے اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا، لیکن اس کی نظم بلوچی رزمیہ شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ زبان گو کہ خالص نہیں، سندھی اور اردو الفاظ کی بھرمار ہے بلکہ کئی اشعار اُس وقت کی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بھی آئے ہیں، لیکن سلاست بندش کی چستی اور روانی اسے متاخرین کی کہی ہوئی رزمیہ نظموں میں ایک نمایاں مقام کا مستحق قرار دیتی ہے۔

شاعر اس دور کے عام شاعروں کی پیروی میں نظم کی ابتدا نعتیہ اشعار سے کرتا ہے اور پھر بلوچستان میں فرنگیوں کی آمد کی داستان سناتا ہے، کہتا ہے:-

پھلنگی اتکہ شہ دیرءَ
رہ ءَ شہ ملک ءِ زرزیرءَ
سمندرءِ لندن ءِ سیرءَ
دھیان ءَ ثابت ءَ دیرءَ
پھلنگی مُلک اِش میرءَ
بگپتہ جواھر و ہیرا

یعنی:-

فرنگی بہت دور سے آیا ہے۔
اس ملک سے جو ایک جزیرہ ہے
لندن سے جو تلخ نمکین سمندر کے درمیان واقع ہے۔
اس کی دانائی دور سے ظاہر ہوتی ہے۔
میروں سے اس نے اس کا ملک چھین لیا۔
اور ان کے ہیرے اور جواہرات لوٹ لئے۔

سندھ فتح کرنے کے بعد انگریزوں نے بلوچستان کا رخ کیا، شاعر نے ایک خوبصورت مگر سادہ پیرایے میں بلوچستان کی حدود میں انگریزوں کے داخلے کا بیان کیا ہے، کہتا ہے:-

گورنر شیر جرنیل ءَ
بزرتی روستم ءِ ٹیل ءَ
ہماں وہرد ہمان ویل ءَ
نہ انت کمی ھنزارانی
رڑیں توپ و جزارانی

کروڑاں پلٹن زورانی!
پلنگی دیر سرین فوجان
دیان ءُ ساوڑی موجان
کمام ءَ جیکم ءَ زرتہ
دہی تان خان گڑھ ءَ گپتہ

سر چارلس نیپیئر
گورنر نے جو ایک بہادر جرنیل بھی تھا
رستم کے طور و طریقے اختیار کئے
اُسی وقت اور اُسی دم
اُس نے آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔
اس کے پاس سپاہیوں کی کمی نہیں،
ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔
گرجنے والی توپوں، جزاروں
پلٹنوں اور رسالوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔
فرنگی کی ان لمبی قطاروں والی افواج
جو ساون کی گھٹاؤں کی طرح اُمڈتی ہیں۔
کی کمان جیکب[۱] صاحب نے سنبھالی
اور تمام علاقوں کو لیتے ہوئے
اس نے خان[۲] گڑھ پر قبضہ کرلیا

اس میں شک نہیں کہ جب انگریزوں نے بلوچستان کا رخ
کیا، خان میر محراب خان کی بعض بے راہ رویوں کی وجہ سے قبائل

۱؎ جان جیکب ۲؎ موجودہ جیکب آباد۔

منتشر ہو چکے تھے، جو قبائل خان سے ناراض تھے وہ ایک طرف غیر جانبدار ہو کر بیٹھ گئے۔ جو خان کے طرفدار تھے، ان میں باہمی کشمکش اور رقابتیں اس حد تک بڑھ چکی تھیں، کہ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کیلئے انگریزوں کا ساتھ دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، قبائل پر خان میر محراب خان کا اثر برائے نام تھا، انگریزوں کے جاسوس اور دلال، خان اور قبائل کے درمیان نفاق کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں مصروف عمل تھے یہی وجہ تھی کہ بلوچ قبائل متفق ہو کر ایک سردار یا لیڈر کے زیر اقتدار انگریزوں کے مقابلے کو نہیں آسکے۔ پنجاب اور سندھ سے جب انگریز بلوچستان کی حدود میں داخل ہونا شروع ہوئے تو بلوچوں نے اگرچہ قدم قدم پر ان کا مقابلہ کیا، اور جان توڑ کر اپنی حدود کی مدافعت کی، لیکن اُن کی مدافعت چونکہ اجتماعی نہیں تھی، بلکہ انفرادی حیثیت سے ہر قبیلہ اپنے سردار کی سرکردگی میں مدافعانہ جنگ لڑ رہا تھا، اس لئے انگریزوں کی منظم و مربوط طاقت کے سامنے اس کا ہتھیار ڈالنا خلاف توقع نہ تھا، جیسا کہ اخوند خان سے متعلق اس رزمیہ نظم میں بگٹی قبیلہ کے سردار کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے،

کشی بخت گوں سلام خان ءَ
توی کیں کوہی سلطان ءَ
سلاح و جنگی سامان ءَ
چپول دا' اوچی دامان ءَ
دِے گزّی، دی پھنیان ءَ
گوئزاں ءَ توپ و گھمبار ءَ

مقام شاپورءِ شہرءَ !
پھنڈل تئی حُکم و دربارءَ
درءَ چَوکی کھیردارءَ
رعیتیں لُٹّ جمارءَ
دَئینت والءَ دی سرکارءَ

سلام خان کے ساتھ
اُس پہاڑی سلطان کے ساتھ
بخت نے یاوری کی۔
اُس نے ہتھیاروں اور سامان جنگ سے لیس ہو کر
اوچ کے دامن کوہ پر شبخون مارا۔
گڑی اور پھنیا کے دیہات سے گذر کر
شاپور کے شہر
اور نگران چوکی کو لوٹ لیا،
رعایا نے جا کر سرکار (انگریزی) سے فریاد کی۔

سندھ و پنجاب کی سرحدات پر لوٹ مار کے ایسے واقعات انگریز
رانوں کو پریشان کرنے کیلئے جاری تھے، کھیری جو بلوچوں کا ایک بہادر
ہے اور اپنے کو شے یا سید کہتا ہے۔ بگٹیوں سے مخالفت کی وجہ سے
یزوں سے ملا ہوا تھا، اڑندو خان نے جو انگریزوں کا بدترین دشمن تھا
ریوں کو اپنے ساتھ ملانے کی ایک دفعہ کوشش بھی کی تھی، اور شاعر کہتا
کہ اپنی اس کوشش میں وہ کسی قدر کامیاب بھی ہوا تھا،

کہیریاں سری ؤ سّ ءَ
نکت لیّا چہ ہچ کس ءَ
صلاح و مصلحت یکّ ءَ!
ہُدا تحقیق و برحق ءَ
بلوچاں گوں مڑگ یک ءَ
اڑندو دَبت سکّھن ساکھتہ
غزاءَ چارؔدہ گیست آکھتہ
کہیری مں شپ ءَ تاکھتہ

یعنی:-

شروع میں کہیریوں کو
جو کسی سے نہیں ڈرتے
ساتھ ملانے کی بہت کوشش کی گئی
انہوں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر
(انگریزوں کے خلاف) لڑائی میں بلوچوں کے ساتھ
مل کر لڑنے کا وعدہ کیا ہے۔
یہ قول و اقرار انہوں نے
خود اڑندو خان کے ساتھ کیا
اور غزا کے لئے اُن کے دو سو اسی آدمی بھی آئے
لیکن رات کو
یہ سب کہیری بھاگ گئے
بہرحال اس رزمیہ نظم کا بیشتر حصہ بگٹیوں اور جھکرانیوں کی باہم

چیچاشوں سے متعلق ہے، جھکرانی چونکہ انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے، اس لئے اڑندو خان بگٹی جو انگریزوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا، ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کر رہا تھا، جو دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اڑندو خان کا آخری حملہ جس میں وہ اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ مارا گیا، شاعر کا اصل موضوع ہے۔ جس پر اس نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ کہتا ہے:۔

اڑندو، مستیں مرد وارءَ
کلام و وھدی اقرارءَ
ملوک ءَ اشتں دل ءَ زہرءَ
کتیءَ سڈر دی چودھارءَ
جمع کت پیادگ و سوارءَ
بجنبہت سیلہین بارءَ
بیاتکیں من شپ ءِ پہرءَ
تلقندرانی گہیں شہرءَ
گلیءَ ہوگا بھو شہرءَ
گلات ءَ پیرتی چو دھارءَ

یعنی:۔

مست اور آدم خور اڑندو نے
اس قول کے پابند اور شریف انسان نے
غصہ میں آ کر
سابقہ قول و اقرار کے مطابق
چاروں طرف بلاوا بھیج کر
پیدل اور گھوڑ سواروں کا ایک لشکر جمع کیا،

اور پھر طغیانی ندی کی طرح بپھرتا ہوا۔
قلندرانیوں کے شہر پر آکر ٹوٹ پڑا۔
چاروں طرف لوٹ مار مچادی۔
اور قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

لیکن شاعر کہتا ہے کہ انتہائی جدوجہد کے باوجود اڑندو خان اور اس کا بگٹی لشکر قلعہ کو فتح نہ کر سکا:-

کہیری دین ما مندءَ
تریلین، زہمءِ ہڑ مندءُ
دُہرا ایمانی نیں ہندءَ
کلات ءَ محکمءَ داشتہ
جتہ اُردو پدا گواشتہ

یعنی:-

دین محمد کہیری نے
جو بہادری اور شمشیر زنی میں بیباک ہے
اپنا حوصلہ قائم رکھ کر
قلعے کو مضبوطی سے بچائے رکھا۔
اور بگٹی لشکر کو
مار مار کر پیچھے ہٹا دیا۔

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ کہ شاعر نے اس نظم میں جو زبان استعمال کی ہے۔ وہ اردو، سندھی اور سرائیکی کا ایک ملغوبہ ہے، دور متاخرین کے شعرا کی زبان رحم علی بیجار کے ماسوا، ان آلائشوں سے اکثر آلودہ ملتی ہے

غربی بلوچستان کے شاعروں کی زبان پر فارسی کا اثر غالب ہے۔ اور
شرقی بلوچستان جو پنجاب اور سندھ کے ساتھ ملاپ رکھتا ہے۔ اردو
سندھی اور سرائیکی یا جٹکی کے زیر اثر ہے اور مرکزی اور شمال مغربی
وچستان، قلات، خاران اور چاغی کی زبان براہوی، پشتو اور فارسی
ے متاثر ہے۔

غرضیکہ زبانوں کے عام کلیہ کے مطابق بلوچی زبان بھی تعمیر او
آمدورفت کی سہولتوں سے بہرہ یاب ہوکر متاثر ہوتی رہی ہے۔ اس لئے
ک میں آج جو بلوچی بولی جاتی ہے۔ وہ اس بلوچی سے یقیناً مختلف لگتی
ہے، جو آج سے سو سال پہلے کے بلوچ شاعر استعمال کرتے تھے۔ لیکن
اب بھی نہیں کہ بلوچی بلوچی نہ ہو بلکہ ڈھواری بن کر رہ جائے۔ بہرحال زیر
بحث نظم میں جو شاعرانہ چابکدستی اور روانی ملتی ہے۔ وہ اسے اس دور کی
بہترین رزمیہ نظموں میں شمار کرانے کیلئے کافی ہے۔ نظم سلیس اور رواں ہے،
بحر، بلوچی رزمیہ اشعار کے مطابق چست اور مترنم ہے۔ اور جزئیات
دلپذیر ہیں۔

کہیریوں نے ایک سوار دوڑا کر میری دیدر کو اڑند خان کے
حملے کی اطلاع کرادی۔ اس موقع پر شاعر نے جو زبان استعمال کی
ہے وہ اس وقت کی اردو زبان کا ایک ایسا نمونہ ہے جو تھوڑی
ل شُد بُد رکھنے والے بلوچ بولا کرتے تھے، زبان واضح ہے۔ اس
لئے ترجمے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی، کہتا ہے:-

کہیری سوار دوڑایا
صاحب سے بات بولایا

چڑھیلا میٹھر بد آیا
حکم جو آپ فرمایا
پکڑلو راہ درستایا

میری دیدر نے اطلاع پاتے ہی اپنے رسالے کے ساتھ اڑندو خان کا تعاقب کیا اور بقولِ شاعر:۔

درنتکہ روچ ہمو ہندءَ
رود ہوتی ءِ سرگاہ ءَ
مقابل بیتہ یکجاہ ءَ

یعنی:۔
جب سُورج طلوع ہوا۔
تو اُس وقت رودِ ہوتی کے اوپر کے حصے پر
خدا کے حکم سے
وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے۔

میری دیدر کے ساتھ رسالے کے سوار اور کہیریوں کے لشکر کی تعداد کتنی تھی، شاعر نے اس کا ذکر نہیں کیا، البتہ اڑندو خان کے لشکر کی تعداد بتلاتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

مڑدکین پنچ صد زرکان اِنت
دراہ باندجاڑ ذرحمان انت
اڑندو شیری گھران انت
سرءَ مندیلی مولان اِنت!

یعنی:۔
لڑنے والے زرکان دبگٹی، پانچ سو ہیں۔

سب تلواروں اور ڈھالوں سے مسلح ہیں
اژدر و شیر کی طرح گرجتا ہے۔
اور اُس نے اپنے سر پر پگڑی گول باندھ دی ہے۔

اب شاعر میدان جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ
عر نے جس چابکدستی، روانی اور باریک بینی سے میدان جنگ
منظر کشی کی ہے وہ بلوچی رزمیہ شاعری کی روایات اور معیار کے
ابق ہے۔ گِنْدر ڈوم اور رحم علی بجار کے علاوہ اس دور کے اور
ی رزمیہ گو بلوچ شاعر نے اس پائے کی منظر کشی نہیں کی ہے ــــ

خطہ ہو:-

گر و کی چاپ تیگھانی
ملوک ءَ پچھکہ زحمانی
مڑدکیں تیگھ میان خان
سری رأمیجہ ڈرکیان
جیتیءُ زحم ءَ پر آ ایمان
پڑ ءَ مہران شنبانی
موہ ءَ ملین رتیسانی
بدانی زرتگنت گانڑی
حساب ءُ گیت بدیانی
نریان ءِ مرد ہمیدانی
سمائی تے ساکھتہ جنگانی

سلہ داول کے وقت پگڑی باندھنے کا خاص طریقہ۔

صبا حان گرتند تو پانی
رستہ گرد آسمانی
ترونگلی چاٹت تیرانی
حتبیٔ تا تجوَ ھزاراتی
ہما کوہ ءُ مزارانی۔
کتیٔ جنگ بادشاہانی
پڑ ءَ سے صد بلوچانی
شہید تنت دین مسلمانی

یعنی:۔ تلواریں بجلی کی طرح کوندتی رہیں۔
بہادروں کی تلواریں بھکتی رہیں۔
لڑنے والوں میں میاں خان نے
جو پہلے کے اعلیٰ نسب رائیجوؔں میں سے تھا،
ہمّت اور حوصلے سے تلوار چلائی
میدان جنگ میں جہران شنبانی نے
جو رئیسوں کا سر غنہ ہے
دشمنوں کی کھوپڑیاں اڑادیں۔
اس نے حساب سے دشمن کے بیس جوانمرد اور
بیس گھوڑیاں ماردیں۔

مواسں ءَ کوہِ سلیمانی

یعنی :- میری دیدار قابل تعریف ہے کہ
اُس نے اَڑندو نوتانی جیسے ایک بہادر کو مار ڈالا
کوہِ سلیمان کے نواح میں

شاعر کہتا ہے کہ اڑندو خان کی موت اور بگٹیوں کی شکست
سے ان کے سردار سلام خان کے حوصلے پست ہوگئے۔ اُس میں مزید
یہ ہمت انگریزوں کے خلاف لڑنے کی سکت باقی نہیں رہی، اس
لیے اُس نے انگریزوں کو سلام کیا۔

شتہ حال دی سلام خان ءَ
قوی ئیں کوہی سلطان ءَ
سلامی جیتہ بھو ہندِ ءَ
چڑیں لاڑکانوءَ نیتہ دا،

یعنی جب سلام خان کو اطلاع ملی
پہاڑوں کے اس طاقتور سلطان کو
تو اُس نے سلام کرکے اُسی جگہ ہتھیار ڈال دیے
اُسے یہ حکم دیا گیا کہ
لاڑکانہ میں جاکر بیٹھ جائے۔

دورِ جناخہ کی رزمیہ شاعری میں گدو ڈوم کی رزمیہ نظم "نفنک" کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ یہ رزمیہ نظم بلوچوں کے بہادر مری قبیلہ اور انگریز سپہ سالار نیپیر (NAPIER) کے درمیان ۲۱ اگست ۱۸۴۵ کو نفنک کے مقام پر لڑی گئی، حملہ آور فوجی دستے کی کمان ریٹ (RIAT) نامی ایک انگریز کپتان کر رہا تھا، توپوں کی گھن گرج میں بہادر مریوں نے تلوار سونت کر حملہ کر دیا، اور آن کی آن میں انگریزی سپاہ کے ساتھ گتھ گئے، دست بدست لڑائی نے وہ سماں باندھا کہ انسانی عقل دنگ رہ گئی، انگریزی سپاہ میں سے بہت کم سپاہی جان بچا کر نکل سکے۔

دوسرے دن جب نیپیر نے ایک اور بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا تو مری جا چکے تھے۔ نفنک کا میدانِ جنگ لاشوں سے پٹا پڑا تھا، مری اپنی لاشیں اور زخمی اٹھا کر لے گئے تھے، یہ کٹی پھٹی لاشیں صرف انگریزی سپاہ کی تھیں،

یہاں پر ایک خاص چیز جو نیپیر نے دیکھی اور جس سے وہ بہت متاثر بھی ہوا وہ ان بہادر انگریزوں کی لاشیں تھیں جنہوں نے بہادری سے لڑ کر جان دی تھی، اور ان کی اس بہادری اور سرفروشی کے نظریہ اظہار کے لئے مریوں نے اُن کی دونوں کلائیوں کو جوڑ کر اُن پر قرمزی دھاگے لپیٹ دیئے تھے تاکہ وہ پہچانے جا سکیں، اور اُن کی بہادرانہ موت مرنے کا اظہار ہو سکے:

سر چارلس نیپیر کے ساتھ فرانس ڈی ویلس (FRANCIS DE VALIS) نامی ایک انگریز شاعر بھی تھا اس نے

اس لڑائی سے متعلق ایک طویل رزمیہ لکھی ہے۔ جو اگرچہ ہمیں مکمل طور پر دستیاب نہیں ہو سکی ہے لیکن اس کا وہ حصہ جو ان قرمزی دھاگوں سے متعلق ہے کسی اور حوالے سے ہاتھ آیا ہے جو اس طرح ہے:۔

ترجمہ:۔ اور جب ہم نے ان کی لاشیں دیکھیں
جو ہوا سے دھوپ میں پڑی سفید ہو رہی تھیں
اُن کی جُڑی ہوئی دونوں کلائیوں پر
اظہار فخر کے لئے
قرمزی دھاگا لپٹا ہوا تھا
اس دلیرانہ اقدام پر
نیپیئر کے بہادروں کی انتہائی گہرائیوں سے
صدائے آفرین بلند ہوئی
تب اس نے کہا کہ:۔
اس واقعہ کی دائمی یادگار رہنی چاہیے
تاکہ وہ لوگ جو بھاگے ہیں۔
اسے پڑھ لیں۔

---

nd when we Found Their bodies left bleaching in
the wind. Around both wrists in glory the the crimson
read was twined. then Napiers knightly heart touches
the core. Rang like an echo to that knightily deed.
Made its memry live For Wer more.
hat those who read.

گدُو ڈوم نے اس لڑائی کو بڑی تفصیل سے ایک رزمیہ نظم میں بیش کیا ہے
لیتے ہیں کہ اس نظم کے کل تقریباً ایک ہزار بند (شعر) تھے۔ لیکن اب لوگوں کو اُن
میں سے بہت کم یاد رہ سکے ہیں۔

گدُو کی نظم ہر لحاظ سے بلوچی رزمیہ شاعری کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہے
لفاظ کا صحیح انتخاب، بندش کی چستی، سلاست، گفتار کی دھج، جزئیات کا
سلسلہ وار بیان اور جذبات کا موثر اظہار گدو کی نظم کی وہ نمایاں خصوصیات
ہیں جنہوں نے اسے رزمیہ شاعری کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا ہے، جہاں تک
دورِ متاخر کے بہت کم شاعر پہنچ سکے ہیں۔

گدُو اس لحاظ سے بھی نمایاں ہے کہ اس نے اس دور کے شاعروں کی
عام روش سے ہٹ کر اپنی رزمیہ کی ابتدا نغنیہ اشعار سے کرنے کے بجائے متقدمین
کے انداز میں خطابیہ پیرایے میں کی ہے۔ کہتا ہے:۔

کناں معلوم هوو یاران
هدائی رکیو ے کاران
تچی چو سبزیں ذواران
بہی چو کپن د لنگاران

یعنی ا۔
میں اپنے دوستوں کو معلومات بہم پہنچانے کے لئے،
خدا کے حکم سے واقع ہونے والی
ایک لڑائی کا قصہ بیان کرتا ہوں۔
(میرے اشعار) ایک تیز رو اور قوی ہیکل
گھوڑ سوار کی طرح دوڑتے ہیں۔
اور کپن (پیالے) اور ہل کی طرح

زمین پر اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

شاعرانہ گفتار میں اس وقت بھالے اور ہل کی تشبیہہ لانا گدو جیسے ایک عوامی شاعر کا ہی کام ہے۔ یہ تشبیہہ نہ صرف نادر اور انوکھی ہے بلکہ نہایت موزون بھی ہے۔ شاعر جو نظم کہنا چاہتا ہے اُس سے اس کا مقصد صرف ایک حکایت بیان کرنا اور سامعین کا دل بہلانا نہیں بلکہ اُن کے دلوں کے نرم گوشوں میں قومی حمیت، جرأت اور جذبہ سر فروشی و سربازی کے بیج بونا بھی ہے، جسطرح کہ ایک کسان اپنے بھالے اور ہل کے ذریعے زمین کا سینہ چیر کر اس میں مطلوبہ فصل کا بیج بو دیتا ہے، گدو اپنے اشعار و الفاظ کے ذریعے دلوں میں یہ بیج ڈالتا ہے، اس نے ان دو شعروں میں ایک ایسی بات کہہ دی ہے جس کی تشریح کے لیئے ایک طویل بحث کی ضرورت ہے۔ یہی گدو کی فصاحت و بلاغت اور شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔

اصل واقعہ کے بیان سے قبل گدو تاریخ کی ان کڑیوں کو ملاتا ہے جن سے گذر کر انگریز اس کے وطن بلوچستان میں آئے۔ شاعر نے انگریز کو یزید سے تشبیہہ دی ہے۔ جو نہایت آسانی اور عمدگی سے ایک عام بلوچ کی سمجھ میں اس طرح آجاتی ہے جس سے کربلا کا وہ تمام واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جس میں بلوچوں نے حضرت امام حسین کا ساتھ دیا اور یزیدی سپاہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے یہاں تک کہ انہیں حلب سے ہجرت کرنا پڑی۔ شاعر بلوچوں کو یہ یاد دلانا چاہتا ہے کہ تاریخ نے ایک بار پھر ان کو ویسی ہی ایک آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ کہتا ہے:-

حوالے ہمچشین بیتہ

یزید جاہی کھڑو بیتہ
وطن وان کلکتہ زیتہ!
امر شاہا وند ءِ بیتہ
حالت پھر ایسی ہوئی ہے،
جس سے گماں ہوتا ہے کہ
واقعی یزید پھر زندہ ہوگیا ہے۔
یہاں سے کلکتہ تک
تمام وطن اس نے چھین لیا ہے۔
شاید مالک (خدا) کا یہی حکم ہے۔

اس اجمال کے بعد شاعر نہایت خوبصورتی سے اُن واقعات کا بیان کرتا ہے جو بلوچستان تک پہنچتے پہنچتے انگریزوں کو پیش آتے رہے۔

کہتا ہے۔

حکم بیتہ شہ ستارءَ
ولایت گپتہ کفارءَ
شہ داؤد پوتران ڈنگءَ
شمو دان گوشتہ بے جنگءَ
ہما سندھ ءِ حبنی میران!
بلوچی ڈنگ ءِ بار زیران
نشان دیمدا تگنت دیران!
سلامی کائنت چو پیران
دیاں زراں پرآ میران

یعنی:۔ خدا کی شاید یہی مرضی تھی،
کہ کفار نے ملک پر قبضہ کر لیا
داوٗد پوتروں (سندھ) کی حدود سے
بغیر لڑے بھڑے وہ گذر گیا،
سندھ کے وہ بنیادی میر (امیران سندھ)
جنہوں نے بلوچستان کی حدود کی
حفاظت کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھایا تھا،
دور سے انگریزوں کے نشان دیکھ کر
اُن کے سلام کو ایسے دوڑے
جیسے پیروں کے سلام کو دوڑتے ہیں۔
فرنگی نے زر دے کر
میروں کو خرید لیا،

شاعر اس سے بھی بے خبر نہیں کہ سندھ کے دوسرے بلوچ سے ٹکرا گئے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

بلوچان ءَ حوال بیتہ
پُر اش جنگ ءَ بگھا بیتہ
دریاباں بکھّر و سکھّر
بلوچان تران کتہ یکمر
مزاری تیمں جتہ ٹکرّ

یعنی:۔ جب دوسرے بلوچوں کو خبر ہوئی۔

کہ ٹالپر لڑائی سے ڈر گئے، اور بزدلی دکھائی
تب بکھر د سکھر کے ساحلی بلوچوں نے
آپس میں صلاح و مشورہ کیا،
اور پھر ببر شیر کی طرح انگریزوں سے ٹکرائے

لیکن انگریزوں کی جہانگیر طاقت کے سامنے بلوچ زیادہ دیر نہیں ٹھہر ... سندھ کو فتح کرنے کے بعد، انگریز بولان سے گذر کر قندھار پہنچے ... تمام ملک کو انہوں نے اپنے زیر نگین کر لیا۔ اس سرگذشت کو تین مصرعوں ... اجمال سے بیان کرتے ہوئے گِدر کہتا ہے

گیا ہیں کابل و قندہار
جنتہ ڈیھ ءُ کتہ اندھیار
چہار کنڈ چلہتی کلدار

کابل اور قندہار کے سبزہ زاروں
اور سارے علاقوں کو
تاراج کر کے ملک میں اندھیر مچادی۔
چاروں اطراف میں
اس کا کلہ دار (سکہ) چلنے لگا۔

کابل اور قندہار کے واقعات کے بعد بلوچستان میں خان محراب خان ... شہادت اور میر حسن خان (نصیر خان دوم) کی انگریزوں سے لڑائیاں ہوئیں ... واقعات پر بھی اپنی نظم میں سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے گدر نے میر حسن خان

(نصیر خان دوم) کو چند ہدایات کی ہیں۔ کہتا ہے

گو ٹشاں میر حسن خان ءَ
سخی آہین سوری و دانا
مہی ۔ ہمراہ گوں انشی ءَ
جہوداں بی ۔ نموشی ءَ
خُدا باڑتی ھلاسی ءَ
سُچی چو دار و آسی ءَ

یعنی:۔

میں میر حسن خان (نصیر خان دوم) سے کہتا ہوں
جو ایک سخی، دانا اور بہادر شخص ہے
اور دل و جان سے اسے نصیحت کرتا ہوں۔
اب انگریزوں کے ساتھ صلح کر کے ان کا ساتھ نہ دے
اُن کے یہودیوں جیسے برے افعال سے غافل نہ ہو
خدا اُن کو تباہ و برباد کر دے۔
وہ لکڑی کی طرح آگ میں جل جائیں
تاکہ اُن سے ہماری جان خلاصی ہو۔

انگریزوں کے خلاف بلوچستان بھر میں جنگ آزادی کی ایک ایسی
اُٹھی جو اُس وقت تو انگریز کو بہا کر لے گئی۔ گہد کہتا ہے:۔

یزید ءُ شری یاد آتکہ
ہزاراں دھکی ماں آتکہ!

پدا شرمندگ ءَ گڑتہ
پس، کلکتہ ءَ ساڑتہ

یعنی

یزید کی طرح شرارت کرنے والے کے خلاف،
لوگ اُٹھے اور اسے ہزاروں ضربیں لگائیں۔
یہاں سے شرمندہ ہو کر وہ واپس بھاگا
اور کلکتہ میں جا کر دم لیا،

لیکن گدو کا خیال غلط تھا، انگریز سندھ و ہند کو چھوڑ کر بنگال نہیں گئے بلکہ بلوچستان سے نکل کر اس نے سندھ میں ڈیرہ جمایا، اور بیٹھ کر حالات کا انتظار کرنے لگا۔ زیادہ دن نہیں گذرے کہ سر چارلس نیپیئر (Sir Charlis Napier) کی سرکردگی میں انگریز پھر بلوچستان کی حدود میں نمودار ہونا شروع ہوئے۔ اور پھر ایک دن کپتان رئیٹ (Riat) نے فوج کا ایک دستہ لیکر کوہستان مری کا رخ کیا، نفُسک کے مقام پر مریوں کے قبائلی لشکر سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ گھمسان کا رن پڑا گدو کہتا ہے:-

جلو آرتہ پرنگی ءَ
بہادریں دو رنگی ءَ
ہڑدنی دل پچنڈی ءَ

یعنی

فرنگی نے
اس بہادر دھوکہ باز نے حملہ کردیا:

لڑائی سے ہمارا بھی دل نہیں گھبراتا۔
ہم مردانہ وار اُس سے لڑیں گے۔

بلوچ ایک بہادر نسل ہے، وہ بہادروں کو جو اگرچہ اس کے دشمن بھی ہوں، عزت کی نگاہ سے دیکھتا اور ان کے بہادرانہ کارناموں کی تعریف کرتا ہے۔ بلوچ اپنے بہادر دشمن کی کبھی توہین نہیں کرتا، اور نہ ہی پس پشت اسے برے ناموں سے یاد کرتا ہے۔ بلوچی رزمیہ شاعری کی سینکڑوں نظمیں ملتی ہیں لیکن شاعر نے دشمن کے لیے کوئی ایسا لفظ کبھی استعمال نہیں کیا ہے جو صرف کسی غیر مہذب اور کمینہ فطرت انسان کی زبان سے نکل سکتا ہے۔ بلوچ کی طرح اس کی زبان بھی شائستہ اور شریفانہ ہوتی ہے۔ انگریزی سپاہ اور ان کے ہتھیاروں کی تعریف کرتے ہوئے گدو کہتا ہے

سپاہی ءِ صفت جوان اِنت
کواتز، دود د میدان انت
وَتی ھمبورہ و تھان اِنت
گوں زورءَ قدرتی مان اِنت

یعنی۔ انگریزی سپاہ قابل تعریف ہے
وہ قواعد (پریڈ) کرتے ہیں
لڑائی کے طور و طریقے جانتے ہیں۔
اُن کی بہت بڑی طاقت ہے
اور لڑائیاں لڑنے پر انہیں قدرت حاصل ہے۔

انگریزوں کے ہتھیاروں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

صفت تی ہتھیارانی
لوار گرّیں گھذارانی
لِد رائیں دیر توارانی
شھالیں جوھر دارانی

یعنی:- اے انگریزو!
ہم تمہارے ہتھیاروں کی
گرم لُو کی طرح گولے پھینکنے والی (توپوں) کی
دور تک مار کرنے والی (بندوقوں) کی
اور چمکتی ہوئی جوہردار (تلواروں) کی
تعریف کرتے ہیں۔

گدُو ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق رزمیہ گو شاعر ہے۔ ایک دم میدان جنگ میں نہیں کُود پڑتا۔ پہلے دونوں لشکروں اور ان کے ہتھیاروں کو ایک سلیقے سے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کے جذبات کو ابھارتا ہے تاکہ جو کچھ وہ آگے کہنے والا ہے۔ اُسے توجہ سے سننے کے لئے تیار ہو جائے نفسک کے مقام پر مریوں کے مقابلے پر جو انگریزی فوج آئی اور وہ جسطرح سے مسلح تھی، شاعر کی باریک بین نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی؛ شاعر جہاں دشمن کے اسلحہ جنگ کی تعریف کرتا ہے وہاں وہ یہ بھی دکھلانا چاہتا ہے کہ مریوں کا مقابلہ معمولی فوج سے نہ تھا، بلکہ دنیا کی ایک بہترین مسلح، قواعدداں اور جنگ آزما فوج سے انہوں نے ٹکر لی تھی، کہتا ہے:-

غلیم پئے یک رہیں ہتھیار
تُپنگ و توپ و جواں رخدار
ہزاراں گوزین پُلی دار
گُھرابین خنجر و کاٹار
جنوکیں گونڈلاں دیر مار
براق و بازیگریں را ہوار
سرءَ تاں نیزگاں بازار
ہمے کُل بلیگنت یک کار

یعنی:۔

دشمن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار تھے،
بڑی اچھی بندوقیں اور توپیں،
جن کی نالیاں چکر[1] دار تھیں۔
ہزاروں توڑےدار بندوقیں بھی ان کے پاس تھیں
غرابین[2]، خنجر اور کٹاروں کی کمی نہیں تھی۔
بہت دور تک مار کرنے والے ہتھیار بھی تھے،
اُچھلنے، کُودنے والے گھوڑے۔
اور (ان کے سواروں کے) سروں پر نیزوں کا بازار لگا ہوا
ان سب ہتھیاروں سے
ایک ساتھ کام لیا جاتا تھا،

---

[1] (Grooved) [2] ایک قسم کی چوڑے دہن والی پستول نما بندوق۔

انگریز ہمارے ملک میں کیوں آئے ؟ گدُ زا اسے سمجھتا تھا، وہ ایک
شاعر تھا جو اپنی قوم کو خبردار کرنا چاہتا تھا کہ انگریز اُن کے وطن میں اسلئے
کہ ان کے وطن پر قبضہ کرکے اُن کو اپنا غلام بنادیں۔ یا باپ دادے
سرزمین سے ان کو نکال باہر کردیں گدُ زام بے شک مری کا لیتا ہے،
اس کا خطاب تمام بلوچ قوم سے ہے۔ کہتا ہے:۔

مری ئے نشتہ من کوہ ءَ
بلوچے ہیستہ گوں دروہ ءَ
جن دکشتی اَش آ کوہ ءَ
پت وشہ ہیرک بڈّوں ءَ

(انگریزوں نے آپس میں طے کرلیا کہ)
مری جو پہاڑوں میں رہتے ہیں۔
اور اپنے کو دھوکے سے بلوچ کہتے ہیں۔
ان کو ان پہاڑوں سے
باپ دادے کے ملک سے،
مار مار کر باہر نکال دو،

لیکن مری آسانی سے انگریزوں کے سامنے جھکنے اور اپنے آباداجداد
سرزمین کو چھوڑنے والے بلوچ نہیں تھے، انہوں نے بھی مادر وطن کو
خون سے رنگین کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا، جو کچھ ان سے بن سکا، لشکر
کے، سر دھڑ کی بازی لگانے کو میدان میں نکل آئے۔ اگست
کی اسی تاریخ کو بعد دوپہر مریوں اور انگریزوں کی جنگ آور سپاہ کے

درمیان میدان کارزار گرم ہوا، گدد کہتا ہے:۔

رٹریں توپاں توار ہیستہ
ہزاراں مار د مار بیستہ
شپ وسیاہیں تہار بلیتہ
مُج و دھنز دگھبار ہیستہ
گہیں مرد بازی گول ہیستہ
ہدائی قدرتاں دیستہ
لگور گلّ چپ وراس بلیتہ
پدا جکّنت بگھائی ءَ
کننت ساہ ءِ تماہی ءَ

یعنی ا۔ پہیتوں پر چڑھی ہوئی توپیں گرجنے لگیں۔
ہزاروں آدمی کُود پڑے۔
گھُپ اندھیری رات چھاگئی۔
آندھی آئی اور چاروں طرف گرد وغبار
بہت سے جوانمردوں نے جو لڑائی میں شا
خدا کی قدرتوں کا نظارہ کیا، د شہید ہو
مگر بُزدل دائیں بائیں بھاگ گئے
تاکہ بزدلی کی زندگی بسر کرنے کو رہ جا
بزُدل ہمیشہ اپنی جان بچانے کی فکر کرتے
نفسک کی اس مشہور لڑائی میں بے شک کہ مری، بہت

شہید ہوئے لیکن انگریزی فوج سے شاید ایک شخص بھی زندہ بچ کر نہیں
انگریزوں کو مریوں نے وہ دندان شکن جواب دیا، جسے وہ بہت
یک یاد کر کے اپنے زخم چاٹتے رہے۔

شاعر نے اس طویل رزمیہ میں بہادروں کی نام بنام تعریف
ہے اور اس درفشانی میں فرنگی بہادروں کو بھی نہیں بھولا ہے۔ ان
سے یقیناً سب کے نام تو وہ نہیں جانتا ہوگا، صرف دو انگریزوں کی،
کے نام وہ جانتا تھا، بہادری اور جوانمردی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

سرءَ لوچ صاحب ءَ مُھرین
ٹرہت چو تمنگوءَ سہورین
ٹکوک مور صاحبیں خان ءَ
جلیتَ زہم ءَ مس میدان ءَ
پتی دپیٹُر کی نام ءَ

سب سے پہلے میں خلوص دل سے
لوچ صاحب کی تعریف کرتا ہوں۔
جو لڑائی میں سونے کا کھرا سِکّہ ثابت ہوا۔
پھر مور صاحب قابل تعریف ہے۔
جس نے ایک بہادر خان کی طرح
میدان جنگ میں تلوار چلائی
اور اپنے باپ دادا کا نام روشن کیا۔

یعنی۔

(Moor) ۲ ، Loch ۱

شاعر نے تمام مری بہادروں، شہیدوں اور بھگوڑوں کے نام لے کر تعریف کی ہے۔ لیکن ہم طوالت بیان کے خوف سے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ گدو کی یہ رزمیہ نظم اس دور کی رزمیہ شاعری میں ایک بلند مقام رکھتی ہے۔

دَورِ متاخر کا سب سے نامور رزمیہ گو شاعر رحم علی بجار ہے اس کے علاوہ اس دور کا اور کوئی رزمیہ گو شاعران بلندیوں تک نہیں پہنچ سکا جن پر متقدمین کے باکمال شاعر اپنے جھنڈے گاڑ چکے تھے۔ رحم علی اس دور کا واحد رزمیہ گو شاعر ہے جس نے بلوچی رزمیہ شاعری کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا، بلکہ اپنے دور کی معاشرتی تبدیلیوں کا بھی ساتھ دیا اور قوم کی نبض پہچان کر اس کا صحیح علاج تجویز کیا۔ رحم علی بجار اس دور میں بھی طبقاتی کشمکش کا احساس رکھتا تھا، اپنی مشہور رزمیہ نظم میں ایک جگہ جاگیردارانہ معاشرہ میں لوگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

نیمی ٹُڈانی سرے ئُنت
نیمی ٹلی نیم شپان
نیم دپی زنبے نہ گندیت
نیمی داری نوکران
نیمی گوں شادی مرادان
نیمی نالی نیم شپان

آدھے لوگ تو پلنگوں پہ آرام سے پڑے سوتے ہیں۔
اور آدھے
(رزق کی تلاش میں) آدھی آدھی راتوں تک بھٹکتے پھرتے ہیں
آدھے لوگوں کو تو روٹی کا ایک لقمہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔
لیکن آدھے لوگ تو اس قدر آسودہ حال ہیں کہ
نوکر رکھ سکتے ہیں
اور آدھے لوگ اپنی کامیابیوں پر خوشیاں مناتے ہیں۔
اور آدھے لوگ، آدھی آدھی راتوں کو
بھوک سے نالہ و فریاد کیا کرتے ہیں۔

اس دور کی اکثر اور بہترین رزمیہ نظمیں مری بلوچوں اور انگریزی سپاہ کے درمیان لڑائیوں سے متعلق ہیں جن میں سے بیشتر کا مصنف رحم علی بجار ہے۔ جو مری کا ریزدار (قبائلی شاعر) اور لڑائیوں کا چشم دید گواہ تھا۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۸ء) کے دوران ایک دفعہ سبی دربار کے موقع پر بلوچستان کے انگریز لاٹ سر جے۔ ریمزے (Sir J. Ramsay) نے سرداروں سے فوج کے لئے بھرتی طلب کی۔ بلوچستان کے دوسرے تمام سرداروں نے انگریزی فوج میں اپنے قبائل سے بھرتی دینا مان لیا سوائے سردار خیر بخش مری کے۔ اس نے بھرتی دینے سے صاف انکار کیا بلوچستان میں اس کی دھوم مچ گئی۔ رحم علی بجار اپنی ایک طویل رزمیہ میں بلوچ عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے سردار خیر بخش کی تعریف میں کہتا ہے :-

هزار شاباش انت خیر بشکھ ءَ
سخی و سوب ءِ لکھ بشکھ ءَ
مزن نام دگھریب پال ءَ
بُزرگی بعیم و اقبال ءَ
قرآن وان و ھدا والا
جہاں ستی انت تی احوال ءَ
نہ کُرتی کافرءِ ٹھال ءَ
گوَشت ھچو پہ ایمانی
نہ دوں مرداں پہ چنداں گی
ھدا والی انت مردانی
سرُوں قربان انت لجانی
دموداں شان انت مردانی
مِنندت بے لقائیَ ءَ
نواں بولنت بگھائیَ ءَ
گرھت ھیل ءَ ھدائیَ ءَ
نہ ددی مرد آئیَ ءَ!

یعنی:۔

خیر بخش کو ہزار شاباش ہے
وہ سخی فتح پانے والا اور لاکھوں بخشنے والا ہے
اس کا بڑا نام ہے۔
وہ غریبوں کی پرورش کرنے والا ہے۔

اس کی ہیبت زیادہ اور اس کا اقبال بلند ہے

وہ قرآن کی تلاوت کرنے والا

اور خدا پرست ہے۔

اس کا حال دنیا کو معلوم ہے کہ

اس نے کافر کا حکم نہیں مانا۔

اور اس نے اپنے ایمانی جذبے سے کام لے کر کہا کہ

ہم چندے (بھرتی) میں آدمی نہیں دیں گے

خدا، جوانمردوں کا والی اور وارث ہے۔

ہم ننگ و ناموس پر اپنا سر قربان کر دیں گے۔

یہی جوانمردوں کی شان ہے۔

اے بلوچو!

اس دار فانی میں اس طرح سے نڈر رہو کہ

لوگ تم کو بزدل کہیں۔

خدا پر بھروسہ کرو۔

ہم آدمی اُسے ہرگز نہیں دیں گے،

ہڑب کی لڑائی سے متعلق جو ۱۹۱۷ء میں جنرل ہارڈی اور مریوں کے درمیان لڑی گئی اپنی رزمیہ نظم میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحم علی بجار کہتا ہے:

پرنگ و جرمن ءِ جنگنت

ذدّمین حاکم مڑ گیتاں

بڑتہ سیاہ دپین توپان
لکھاں گار کنگیتان !
سری لوٹیں تمندا ران
سیوی د رو گیتان !
تمندار سیول ءَ مچنت
جرگایان کنگیتان !
بلیٹگی لوٹگن مردان
بگھائی ءَ دیگیتان

یعنی:- فرنگی (انگریز) اور جرمنوں کی لڑائی ہے
دونوں بادشاہ لڑ رہے ہیں۔
سیاہ دہن توپیں گرج رہی ہیں۔
لاکھوں کو غارت کر رہی ہیں۔
پہلا بلاوا سرداروں کو آیا ہے۔
وہ سبی کو جا رہے ہیں۔
سردار سب سبی میں جمع ہو چکے ہیں۔
اور جرگے کر رہے ہیں۔
فرنگی اُن سے (بھرتی کے لئے) آدمی مانگ رہا ہے
وہ بزدلی دکھا رہے ہیں۔

ایک اور نظم میں بھی اسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے رحم علی بجار کہتا ہے

پلنگی دمیدنت زواران

سری لوٹن تمندارانی

منی دست ءِ نمک خواران

کہ من داتنت پہ درباران

چخاگوں شال و بلگھاران

اگہ آنہان ءَ گیر آرت

مرد چی مارا بکار رست

فرنگی اپنے سوار بھیج کر

پہلے سرداروں کو بلاتا ہے۔

اور ان سے کہتا ہے:

اے میرے ہاتھ کا نمک کھانے والو!

میں جو خلعت اور انعام دیا کرتا تھا تم کو درباروں میں

چغے، شال اور ریشمی کپڑوں کے

اگر تم ان کو یاد کروگے

تو آج ہمارے کام آؤگے۔

سردار خیر بخش مری، رحم علی کی رزمیہ نظموں کا ہیرو ہے۔ اس لئے ان کے رزمیہ اشعار پر تبصرہ کرنے سے قبل یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ سردار [خیر بخش] مری کو بھی قارئین سے روشناس کرایا جائے۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ سردار [خیر بخ]ش مری انگریزوں کا بدترین مخالف تھا، انگریزوں نے اسے قابو میں [لانے کے] لیئے انتہائی کوششیں کیں، لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ یکم جنوری ۱۹۰۳ء [باد]شاہ برطانیہ کی تاجپوشی کے موقع پر سردار خیر بخش کو نواب کے خطاب

سے نوازا گیا۔ اور جون ۱۹۱۵ء میں اُسے سی آئی ای بھی بنا دیا گیا، مگر سردار خیر
جیسے درویش صفت مجاہد پران پُرشکوہ خطابات اور نوازشات کا کوئی
نہیں ہوا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں جب بلوچستان کے سرداروں سے جنگ عظیم
حکومت برطانیہ کی امداد کے لئے فوجی بھرتی دینے کا مطالبہ کیا گیا تو سردار خیر بخش
مری وہ واحد سردار تھا جس نے حکومت برطانیہ کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا۔
جب انگریزوں نے اُس کے علاقہ پر حملہ کر دیا تو اُس نے ہڑب اور گمبز
مقام پر اُس کا مقابلہ کیا، اور وہ تاریخی لڑائیاں لڑیں جو رحم علی بگارانی کی
نظموں میں زندہ وجاوید اور جان نثار بلوچوں کی ملّی تاریخ کا جزو بن چکی
ہیں۔ مریوں کو ان لڑائیوں میں شکست ہوئی، سردار خیر بخش نے صلح نامہ
پر دستخط کر دئے۔ لیکن ان کی غیرت وخود داری اور جذبہ آزادی خواہی میں
کوئی فرق نہیں آیا،

جنگ عظیم کے اختتام پر انگریز حاکموں نے ایک دفعہ پھر قبائلی سرداروں
کو آزمائش میں ڈال دیا۔ سبی دربار کے موقع پر بلوچستان کے لاٹ
نے شاہی جرگہ کے تمام سرداروں کو بلا کر کہا کہ اُس کی بگھی کو سٹیشن تک کھینچ کر
لے جائیں، اس دفعہ بھی سردار خیر بخش مری ہی وہ واحد سردار تھا جس نے
کی بگھی کھینچنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ لاٹ کو برا بھلا بھی کہا۔ ملا مزار بنگلزئی
اپنی مشہور بلوچی نظم میں جو اسی واقعہ سے متعلق ہے، سردار خیر بخش کی جرأت
رندانہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

ترا آفریں بات خیر بخش مری
تئی چماں استیں حیاے زری

حلالنت ترا شیر مات ءِ گوئری
ترا عُمر باتں ، چڑکوہ چھلگری

اے خیر بخش مری ! تجھ پر لاکھ بار آفرین ہو۔
تیری آنکھوں میں غیرت کی بوند باقی ہے۔
تجھ پر ماں کا دودھ حلال ہے۔
خدا کرے کہ تجھے چھلگری پہاڑ جتنی عمر حاصل ہو۔

بالآخر انگریزوں نے مریوں کو انکار کا مزہ چکھانے کا فیصلہ کر لیا اور اعلان
یا کہ مریوں سے جبری بھرتی لی جائے گی۔ گنبز کی لڑائی سے متعلق اپنی رزمیہ
رحم علی کہتا ہے :۔

کوٹ سانگان ءَ چڑھتہ
دھکیتہ پہ چاکر ءَ
من گران مرداں پہ زور ءَ
ہر بہنے بنتں ، بگھا
شوا ، مئے جنگ ءَ نہ پُچّت
کھند تہ ٹوپی سرءَ !

(فرنگی) کوٹ سانگاں سے چڑھ کر
چاکر (دنگی) میں آیا۔
میں آدمی تم سے زبردستی لوں گا۔
اور تم کو ہر طرح سے نیچا دکھاؤں گا۔

تم ہم سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے
سر پہ ٹوپی رکھنے والے انگریز نے ہنس کر کہا۔

رحم علی کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ نہ صرف بلوچی رزمیہ شاعری میں زبان کا مالک اور شعر گوئی میں پہاڑ سے بہنے والی سیلابی ندی کی مانند پر جوش و پُر آب ہے بلکہ وہ ملک کے عام سیاسی اور سماجی حالات سے بھی باخبر ہے۔ انگریزوں کی غلامی میں آنے سے بلوچوں کی آزادی پر جو پابندیاں لگ گئی ہیں اور مختلف ٹیکسوں سے ان کو جس طرح لوٹا اور کچلا جا رہا ہے رحم علی کی نظروں سے وہ پوشیدہ نہیں ہیں اور اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں ہے۔ کہ انگریزوں کے خلاف اُٹھنے کی وجہ صرف یہ نہیں کہ انہوں نے بلوچوں سے فوج میں بھرتی طلب کی ہے بلکہ اس اٹھان اور بغاوت کی کئی دوسری وجوہ بھی ہیں۔ اپنی ایک رزمیہ میں ان وجوہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ انگریزوں کی آمد سے ؛

وَلایت بیستہ ٹھیکائی
تڑی وشنگ و ٹیائی
جھوڈ برتہ پہ ردیائی
وطن گپتہ پہ دانائی
ھنر بازنتی ، ٹھگائی!
جھوڈی کار وودرو ہائی
گھین ءِ ذات لوٹائی

ہاکہ نوکرنت جبائی !
نہ گوں سیاہکار نا شرمائی
ذینت مردان پہ چندائی
وطن دانشں پہ مستانی
کتش پہ بیسرہ نو بہائی

ملک پر طرح طرح کے ٹیکس لگے۔
ترنی[1] ٹشنگ اور ٹبائی مقرر ہوئی
یہودی (انگریز) اپنی چالبازی سے بہت کچھ لے گیا،
وطن پر اس نے دانائی سے قبضہ کر لیا،
اُسے بہت سے ہنر یاد ہیں۔
اور وہ دھوکا دے جاتا ہے۔
یہودی کا کام ہی دھوکا دینا ہے۔
وہ ہمارے اچھے اچھے آدمیوں کو بلاتا ہے۔
اُنہیں انعام دیتا ہے،
اور ان کی تعریفیں کرتا ہے۔
اور وہ جو واقعی اس کے نوکر بن جاتے ہیں
وہ لوگ اپنی سیاہکاریوں سے نہیں شرماتے:
اور چندے (بھرتی) میں اسے آدمی دے دیتے ہیں۔
یہی لوگ ہیں جنہوں نے۔

---

[1] ایک ٹیکس جو مال و مویشیوں پر لیا جاتا تھا۔

اپنا وطن تحفے میں اُسے دیدیا ہے۔
پیسوں کے عوض (وطن کو) بیچ دیا ہے

بلوچی رزمیہ گو شاعروں کو عرف عام میں پہلوان اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اشعار میں نام لے لے کر بہادروں کی تعریف اور بھگوڑوں کی ہجو کرتے ہیں۔ تاکہ نوجوان نسل اُن سے اثر اور عبرت حاصل کرے، اور اپنی قوم و وطن اور ننگ و ناموس پر کٹ مرنے سے دریغ نہ کرے۔ وہ جنگبازوں کو حوصلہ دلاتے اور ان کے دل بڑھاتے ہیں۔ اس لئے پہلوان کہلاتے ہیں۔ فردوسی کی مشہور رزمیہ داستان شاہنامہ سے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے کہ:-

ہر آنکس کہ شاہنامہ خوانی کند
اگر زن بود پہلوانی کند

یعنی جو شخص شاہنامہ پڑھے گا، وہ اگر عورت ہو تو بھی پہلوانی کرے گی۔ بالکل یہی بات رحم علی بجار اور بعض دوسرے رزمیہ گو بلوچ شعرا کی نظموں سے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ وہ جہاں بہادروں اور شہیدوں کی تعریفیں کر کر کے نئی نسل کو جوانمردی، شجاعت اور قربانیاں پیش کرنے کا درس دیتے ہیں۔ وہاں وہ بزدلوں وطن دشمن غداروں اور جنگ کے بھگوڑوں کی ہجو کہہ کر اس قسم کی بزدلانہ حرکتوں سے نوجوانوں کو نفرت دلاتے ہیں۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ انگریزوں کے خلاف اس دور کی لڑائیوں میں سردار خیر بخش مری، رحم علی بجار کا ہیرو تھا، اپنی نظموں میں ہر موقع پر

اس نے سردار خیر بخش کی جرأت اور اوصاف حمیدہ کی تعریف کی ہے اس کے ساتھ ہی اس نے وطن دشمن غداروں کی مذمت بھی کی ہے، چنانچہ ایک مقام پر انگریزوں کی مدد کرنے والے سرداروں میں سے چند ایک کا نام لے کر رحم علی بجار کہتا ہے:۔

یکصت و صد مرد داتہ بہرام ءَ
پنجاہ مرد داتہ بڑزی بزدار ءَ
ہژدہ مرد داتہ دریشک ءِ سردار ءَ
مصری خان اِنت گوں ہشت وده سوار ءَ
ما مریں گوں خیرن سردار ءَ
مئے مری مچی ہیستہ کاہان ءَ
چیپ شہ کوٹ و چپے سانگان ءَ
ہر بلان ءَ شہ رب ءِ آمان ءَ

یعنی:۔

سردار بہرام (خان، مزاری) نے
ایک سو آدمی اکھٹے کر دیئے۔
اُوپر کے بزداروں نے پچاس آدمی،
اور دریشک کے سردار نے اٹھارہ آدمی دیئے۔
مصری خان آٹھ دس گھوڑ سواروں کے ساتھ گیا،
لیکن ہم مری!
اپنے سردار خیر بخش کے ساتھ ہیں۔
ہمارا پہلا اجتماع کاہان میں ہوا۔

کچھ مری کوٹ (منڈائی) سے
اور کچھ سانگان سے بھی آئے۔
اے مریو!
خدا تم کو ہر بدی سے اپنی امان میں رکھے۔

مریوں اور انگریزی افواج کے درمیان اس سلسلہ کی پہلی جنگ مری کے علاقے گمبنر اور دوسری ہڑب کے مقام پر ہوئی۔ رحم علی اپنی اس مشہور نظم میں نہ صرف میدان جنگ کا مشاہدہ بیان کرتا ہے بلکہ ان بزدلوں اور غداروں کو بھی نام لے کر کوستا ہے۔ جو انگریزوں کا ساتھ دے کر اور اُن کے رہنما بن کر اپنے وطن دوست اور قوم پرور مجاہد مریوں کے مال مویشی اور گھر بار لوٹنے کو آتے ہیں۔ یہ داستان جو رحم علی بیان کرتا ہے اس قدر تلخ اور طویل ہے کہ تفصیلات میں جانے سے کئی قبائل اور ان کے بلند بانگ سرداروں کی قوم پرستی کے دعوؤں پر حرف آتا ہے۔ اس لئے ان کو زیر بحث لانا ہم مناسب نہیں سمجھتے، بہرحال رحم علی کہتا ہے :-

مری پہ کوہ سرو گٹّان
مڑاتیاں دیشگیتان!
توے خیر بشکھ نوابانی
ترا انصاف ڈھہگیتان
گھور دلنڈریں سردار
تئی ادطاق ءَ پلگیتان
مڑائیں پیر دپیغمبر

تیٔ غورءَ کنگیتان

یعنی:-

مری پہاڑوں اور گھاٹیوں میں لڑ رہے تھے

اے خیر بخش نواب!

وہ آپ کے ساتھ انصاف کر رہے تھے

لیکن دوسری طرف

بزدل اور بدمعاش سردار

آپ کا مقام چھیننا چاہتے تھے،

مگر بڑا پیر (غوث الاعظم) اور پیغمبر

آپ کے مددگار تھے۔

اس لڑائی سے متعلق ایک جگہ رحم علی شہیدوں پر خدا کی برکتوں کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

پلنگی اَغتگنت پُوڑءَ

جہازاں بال دیگیتان!

مزاراں پھلّوءَ بستاں

مری بازیں کشگیتان

چو نوداں دستے زرتہ

ہٹرب ءَ نود شلگیتان

ہٹرب ءِ کشتگیں مردان

حضوری خیر ڈھگیتان

یعنی:-

فرنگی بوڑ کے مقام پر آئے ہیں
اور ہوائی جہاز اڑا رہے ہیں۔
شیروں نے آج کمر باندھ لی ہے
مری بہت زیادہ مارڈالے جا رہے ہیں۔
بادلوں نے ہم سے دوستی کی ہے۔
ہڑب (کے میدان جنگ) پر بادل برس رہے ہیں
ہڑب (کی لڑائی) میں شہید ہونے والوں پر
خدا کی رحمتیں برس رہی ہیں۔

ہڑب کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے مریوں کے پاس صلح کا پیغام
بھیجا، چند شرائط پیش کیں اور کچھ مراعات دینے کا وعدہ کیا
رحم علی کہتا ہے:-

آ ہتہ لُونی ءِ نواب خان
گرن اُتی حالے دلی
اَگ مری جنگ ءَ نہ دُنیا
نوکری ہندی رسی!
کوہلو و سیبی ڑ حلاس اِنت
بالا ڈھاک ءَ گرسنی
چاردہ سال معاف انت تئی ڈہ
اَشں تہ ٹھیکا ءَ نہ گی

یعنی:-
لونی (قبیلہ) کا سردار نواب خان آیا۔

وہ ایک راز کی بات لے کر آیا تھا
اس نے کہا کہ اگر مری نہ لڑیں۔
تو انہیں نوکریاں ملیں گی۔
کوھلو سینجاڑا اور اوپر ڈھاک گرسنی تک کے علاقے پر
مالیہ نہیں لیا جائے گا۔
مریوں کے علاقے کو چودہ سال تک معافی دیجائے گی
ان سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

اس موقع پر مریوں میں سے ایک جذباتی شخص نے انگریزوں کے قاصد
سردار نواب خان لونی کو تلوار مار کر زخمی کر دیا بہرحال مریوں نے انگریزوں
کو جواب دیا کہ:-

نہ کٹیتوں نوکری ڈھب ءَ
دُنیائیَ ھُلکی ھَبَّ ءِ
سروں حیراتِن پہ رب ءَ

ہمیں نوکری کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔
دولت کے لئے
لوگوں پر بھونکنے کا فن ہم نہیں جانتے
ہم خدا کی راہ میں
اپنے سر قربان کرنے والے لوگ ہیں۔

اُس کے علاوہ سردار خیر بخش مری نے بلوچستان کے لاٹ کو لکھا کہ

ہم بھرتی کبھی نہیں دیں گے، اگر تجھے لڑنا ہے تو میدان میں نکل آ۔ رحم علی نے
خیر بخش کے اس فیصلے کو سراہتے ہوئے کہا ہے:۔

ماس زئیت نیچے نیاریت
نامی بیت خیر بشکھ نواب
گوازگ ءِ لولی حلالنت
ماس دپس ءَ دا تکنت
ماترا مرداں نہ دُوں ءَ!
باج اَچ جنگ ءَ سوا!
جنگ ءِ سامان ءَ کتی ءَ
در مکن بیا یبر ءَ
مرد ترا ہرچی گذرانت
کلاں کاردں گنبز ءَ!

یعنی

ماں پھر ایسا بیٹا نہیں جنیگی
جو خیر بخش نواب جیسا ہو۔
پنگھوڑے کی لوریاں
جو ماں باپ نے اسے دی ہیں۔
اس پر حلال ہیں
اس نے انگریزوں سے کہا
ہم آدمی تمہیں نہیں دیں گے
ہم تم سے لڑیں گے

اگر تم بھی لڑنا چاہتے ہو۔

تو پھر دیر نہ کرو۔

لڑائی کے لیئے تیار ہو کر

ایک دم چلے آؤ۔

جتنے آدمیوں کی تجھے ضرورت ہے

وہ سب ہم گنبز کے مقام پر لے آئیں گے۔

ایک اور شاعر ملا ہومر مری نے بھی اس واقعہ سے متعلق

ایک رزمیہ نظم کہی ہے۔ وہ انگریزوں کے خلاف لڑنے کیلیئے مریوں

سعدی کا ذکر اسطرح کرتا ہے:۔

مری ءِ تات و بچار ءَ

نہ دون پوجاں ما سرکار ءَ

خدا یکّنت و برحقّنت

مری مَن لیکھواں لکّھنت

نَفک ءِ روش ترا گیرں

مری جنگ ءَ پہ نو دیرں

مریوں کا فیصلہ یہ تھا کہ

ہم سرکار کو بھرتی نہیں دیں گے۔

خدا واحد و برحق ہے

مریوں کی تعداد ایک لاکھ ہے۔

اے فرنگیو،

نفسک کی لڑائی تمھیں یاد ہے۔

مری آج بھی اسی طرح

تازہ دم اور لڑائی کے لئے تیار ہے۔

رحم علی بجار کہتا ہے کہ مری کہتے تھے :-

مڑونی زور ستار ءَ
علی دُلدل ءِ زوار ءَ
مروچی اتکہ مئے وار ءَ
سری کٹوں چو سیاہمار ءَ

یعنی :-

ہم ان (انگریزوں) سے
خدا کے حکم سے ضرور لڑیں گے،
حضرت علی، دلدل سوار
آج ہماری مدد کو آئے ہیں۔
ہم ان انگریزوں کے سروں کو
سانپ کے سر کی طرح کوٹیں گے۔

رحم علی بجار صرف مری قبیلہ کا دریزواں قبائلی شاعر تھا لیکن آج ہم اس کی شاعرانہ عظمت اور قوم پرستانہ جذبات کے پیش نظر اُسے بلوچ قوم کا قومی اور انقلابی شاعر مانتے ہیں وہ مری قبیلہ کے شاہیجہ طائفہ سے تھا اور گرسنی علاقہ مری میں رہتا تھا۔ لیکن آخیر عمر میں اپنے عزیزوں سے ناراض ہو کر پٹھانوں کے علاقے ژوب چلا گیا اور وہیں پر وفات پائی۔

رحم علی کی شاعری میں اشارہ، کنایہ کی کوئی بات نہیں، اور نہ ہی اس نے اپنے اشعار میں ذو معنی الفاظ یا ایسے تشبیہہ و استعارے استعمال کیے ہیں جن سے اس کے اشعار کے سمجھنے میں عام آدمی کو کوئی مشکل پیش آئے، اُس نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اُسے سیدھی سادی زبان میں اس خوبصورتی اور برجستگی سے بیان کیا ہے کہ سننے والے کے سامنے مناظر بمع کے جذبات لمحاتی کیفیت، ڈر اور نڈرتا کا ایک ایسا نقشہ کھنچ جاتا ہے کہ دل و دماغ متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

انگریزوں کو جب سردار خیر بخش کا جواب مل جاتا ہے تب انگریز اپنی فوج کو حملہ کرکے کاہان پر قبضہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ رحم علی کہتا ہے:-

دپ ءَ کاہان ءِ بچّار ءَ
گرانی شہر د بازار ءَ
برانی بھیم و تو مار ءَ
کنوں نامے دی جمار ءَ

یعنی:-

ان (انگریزوں) کے منہ میں کاہان کا نام تھا،
اور ڈینگیں مارتے تھے کہ
ہم کاہان کے شہر د بازار پر قبضہ کرلیں گے
اس کے نام سے جو خوف و دہشت پھیلی ہے۔
اُسے لوگوں کے دلوں سے نکال دیں گے،
اور ایک ایسا نام پیدا کریں گے
جو ہمیشہ یاد رہے گا۔

رحم علی کہتا ہے کہ وہ کافر تھے اس لئے تکبر کرتے اور غیب کی باتیں کہتے تھے۔ لڑائی مردوں کا کھیل ہے۔ دلیر اور جوانمرد یہ کھیل کھیلنے کو میدان جنگ میں کود پڑتے ہیں۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

کے ءَ را سدھ انت گھیبانی
خدا وت بیت ودت زانی

یعنی:۔ غیب کا علم کسے حاصل ہے
غیب کی بات جاننے والی صرف خدا کی ذات ہے
وہی جاننے والا اور باقی رہنے والا ہے۔

انگریزوں کی فوج کشی کی خبر پاکر سردار خیر بخش بھی اپنے قبیلہ کو جمع ہونے کی اطلاع دے دیتا ہے

وطن معلوم کتگ کاہان
شتا ہیں قاصد وڈاھان
چہ سرد ست دسرآ گاہان
سیمی سرد پ و نرگاہان
کلنت چہ چار دہی ماہان

یعنی:۔ کاہان سے تیز رو قاصدوں اور خبر دار کرنے والوں کے ذریعے
علاقے کے تمام باشندوں کو اطلاع دے دی گئی
شمال اور جنوب اور چاروں اطراف سے
بادلوں کی طرح امڈ امڈ کر لشکر جمع ہونا شروع ہوا
وہ خوشی سے، چودھویں کے چاند کی طرح کھل رہے تھے۔

بلوچوں کا قدیم سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ لڑائی پر جانے کیلئے دولہے کی طرح بن سنور کر گھروں سے نکلتے ہیں۔ ایرانی بلوچستان کا نامی گرامی شاعر احمد داجو کہتا ہے۔

بستگاں لانک دڈ کوں دا ہتھیار
چل شپیں کارچ د نقرہ ئیں کٹار
سرگل د درد ہانی لڑیں مرد وار
سر دتی سالونکی گٹک بازار

یعنی:۔ میں نے کمر کس کر ہتھیار باندھ لئے۔
چالیس مہروں والا چھرا
چاندی کے دستے والی کٹار
اور دشمن کے سرغنوں کو کاٹنے والی آدم خور تلوار سجالی
اور اپنے کو
دولہے کی طرح میں نے سجایا سنوارا

یہی بات رحم علی، مری بہادروں سے متعلق کہتا ہے:۔

ریشں بواں مشتگی ءَ
بروت دتی گوں ہاتران !
بورگوں نچلاں کتغ !
گوں بنات دبکھلان

ترجمہ: (انہوں نے) اپنی ڈاڑھیوں پر خوشبو
اور مونچھوں پر عطر ملا۔

تن بدن کو مخمل اور بنات کی پوشاک سے ڈھانپا
اور گھوڑوں کو (پشمینہ) پھولوں سے سجایا۔
ایک دو دن کے اندر اندر زرنڈ کے تھانہ میں تین ہزار مریوں
جمع ہوگیا، رحم علی کہتا ہے:۔

سئے ہزار مرد مچ ننت دیما
مں زرند ءِ تھانہ ءَ
جُبّ و جگیاں جننگ ءَ
ھیل اتنت پہ خیرن ءَ

یعنی:۔

تین ہزار لڑا کے جوانمرد
زرنڈ کے تھانہ میں پہلے جمع ہو چکے تھے،
اور وہاں پر مورچے اور جھگیاں بنا کر
اپنے سردار خیر بخش کا انتظار کر رہے تھے،

بالآخر سردار خیر بخش کئی ہزار مریوں کے لشکر کے ساتھ پہنچ گ
دوسرے دن میدان کارزار گرم ہوا، مری انگریزی سپاہ کی طرف
بڑھنے لگے، مریوں کا ارادہ انگریزی فوج کے ساتھ دست بدست
لڑنے کا تھا لیکن انگریز ایسی لڑائی نہیں چاہتے تھے۔ ان کو صرف یہ
تھا کہ مری، ان بندوقوں کی زد (Range) کے اندر آجائیں۔ اس کیف
کو رحم علی نہایت خوبصورت الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے

بٹ دلنگی لڈ گانت
گھوس اتی دروازگ ءَ

سوڈران منتا نہ بیستہ
توپچاں پیش ءَ جتہ

مری اپنے ریشمی ملبوسات میں
جھوم جھوم کر آگے بڑھتے رہے۔
سولجروں کو دو بدو جنگ کا حوصلہ نہیں رہا۔
اور انہوں نے گولی چلانے میں پہل کردی۔

اب جو لڑائی شروع ہوئی تو تمام دن جاری رہی۔ انگریزی فوج محفوظ ...ات پر مورچہ بند تھی۔ مریوں نے تلواریں سونت کر ان کے مورچوں پر بڑھ بڑھ ...کئے اور اس طرح ہزاروں جانیں گنوائیں۔ انگریزوں کی طرف سے کچھ نقصان ...نہیں ہوا۔ جمن علی بجار کہتا ہے:-

جُرتہ کار ءِ ھمے کار ءَ
قبچر ءِ واں عقد دار ءَ
ھمودان گنڈ شپی تار ءَ
مریان زوری ستار ءَ
جنت مس ٹوڈران ڈار ءَ
سرش داتنت مس بازار ءَ
اچ ءِ لج ءِ و ناچار ءَ
جت د بور ریتی ٹربگان
پدا پر ریتی اشں درنگان
فتح نہ دیستی من جنگان

حُکم چو بیننہ الائیٔ
نبی پیغمبر ءِ آئی

یعنی:۔

آخر جو کام ہونا تھا وہ ہو کر رہا
صبح سے دو پہر تک
اور پھر اس وقت سے رات کے آخری پہر تک
خداوند ستار کی شامل حال طاقت سے
مری اپنے سینے گولیوں کے سامنے پیش کرتے رہے
اور لڑائی کے گرم بازار میں اپنے سر دیتے رہے
وہ اپنے ننگ و ناموس کے لئے لڑنے پر مجبور تھے
لڑائی کے سخت ریلوں نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔
انہیں گھاٹیوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔
لڑائی میں انہیں فتح حاصل نہیں ہوئی۔
شاید خدا اور اس کے نبی اور پیغمبر کی مرضی یہی تھی۔

رحم علی ایک حقیقت بین اور راستباز شاعر کی طرح اپنے بہادر قبیلے کی شکست کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن کہتا ہے کہ انگریز بھی:۔

شُتہ پہ بھاج و بھاجائیٔ!
کتئے من لندن ءُ دراہی
نہ بڑتی سپتگین پائی:

یعنی:۔

بھاگم بھاگ ایسے گئے کہ

لندن میں جا کر دم لیا،
ہم سے تو وہ
ایک چھدی ہوئی پائی بھی نہ لے جا سکے

رحم علی بجار کی رزمیہ نظموں میں رزمیہ شاعری کے وہ تمام اوصاف ملتے ہیں جن سے نظم مؤثر، پسندیدہ اور جاندار بنتی ہے۔ اس میں لڑائی کی وجوہ، متحارب گروہوں کے جذبات کا اظہار، لشکر کی تعداد، اسلحہ جنگ کی تعریف اور بھگوڑوں کی ہجو اس ترتیب اور انداز سے ہوتی ہے کہ اس کا کوئی شعر غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا،

رحم علی بجار نے اپنی رزمیہ نظموں میں سینکڑوں مری بہادروں، اور جان نثاروں کا نام لیا اور تعریف کی ہے مثال کے طور پر ہم ان میں سے چند ایک سے متعلق رحم علی کے اشعار پیش کرتے ہیں، میر لی بکر مری میر ہویغ مری کی تعریف میں کہتا ہے:-

جُڑاں جیہر کمان گواران
رڑاں بی بجرء سینگاران
تہی تازی من جنٹرساران
ہے ذآمیں سپہداران
نہنبکہ کہُکری گوارنت
نہیے ماتشں پدا کارنت
پدی نندنت وگیہ آرنت
نہنگ نیں باہر و نہالان
حضوری سوہ من گال انت

دُھرا بے مٹ دبے سیال انت

جہاں ستی انت غریب پال انت،

یعنی:- میں بادلوں سے مینہ کی جھڑی کی طرح

(دیوُغ) بی بکر کی تعریف میں مصرع سجا کر لگاؤں گا۔

بی بکر! تیرا اسپ تازی کوندتی بجلی کی طرح ہے

تیرے جیسے سپہ سالار نہ تو بادلوں سے ٹپکتے ہیں

اور نہ ہی مائیں پھر کبھی جن سکتی ہیں۔

بعد کو آنے والے (بلوچ)

بیٹھ کر تجھے یاد کیا کریں گے۔

ذیشان باہر اور میر نہالان

جن کی بہادری کا ہر شاعر مداح ہے

یہ سدا لاثانی اور لاجواب رہے ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ یہ غریب پرور ہیں۔

اسی طرح میر ہداداث مری کی تعریف میں کہتا ہے:-

ہداداث بھنگ و بوآنی

وردکیں نیٹرہ ءِ ثانی

سلاحش بستہ جنگانی!

بردکیں تیگھ خراسانی

مرءِ منزل مسکانی!

کمیت سینگارتہ شوانی
حریف انت ننگ دجنگانی
نگاہدار انت گھریبانی

یعنی

خداداد پر کیف، معطر شخصیت رکھتا ہے
وہ کاٹنے والے نر اونٹ کا ثانی ہے۔
اس نے اسلحہ جنگ پہن لئے ہیں۔
خراسانی برندہ تلوار کمر میں باندھی ہے۔
اور مشک آلودہ خود سر پہ پہن لیا ہے۔
اس نے لڑائیوں کی اپنی کمیت گھوڑی کو سنگھارا ہے۔
ننگ کے معاملات اور لڑائیوں میں وہ اس کا ساتھی ہے
وہ غریبوں کا محافظ ہے۔

گنبز کی لڑائی بلوچستان کی تاریخ میں جانبازی اور سرفروشی کی ایک بے نظیر داستان ہے۔ انگریزوں کی جدید ہتھیاروں سے مسلح افواج قلعہ اور سنگین مورچوں پر پہرے جمائے ایک طرف اور صرف تلواروں سے مسلح مری بلوچوں کا لشکر کھلے میدان میں دوسری طرف داد شجاعت دے رہے تھے، مری سر ہتھیلی پر رکھ کر حملے پہ حملہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ لاشوں پر لاشیں گرتی جاتی ہیں۔ انگریزوں کا توپ خانہ آگ برسا رہا ہے۔ توپ کے گولوں سے انسانوں کے پرخچے اڑ رہے ہیں۔ بندوقیں گرم اولے برسا رہی ہیں۔ لیکن مری جانبازوں کے قدم نہیں رکتے، رحم علی کہتا ہے:-

کافرءِ تیر چو تروِنگل ءَ گوازنت
پہری، کفند و حاین ڈو برش وازنت

یعنی:-
کافروں کی (بندوقوں سے) گولیاں
اولوں کی طرح برس رہتی ہیں۔
اور قابل فخر نوجوان ہنس ہنس کر
انہیں اپنے سینوں پر روکتے ہیں۔

بالآخر شدید اتلاف جان کے باوجود مری انگریزوں کے توپخانے پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ ایک جان نثار مری اپنی چادر لپیٹ کر ایک توپ کے منہ میں گھسیڑ دیتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو حوصلہ دلاتا ہے، کہ "ہمت کرو، اس کا منہ میں نے بند کر دیا ہے۔" گورا سپاہی جو حیران و ششدر کھڑا اس سادہ انسان کی جرآت کا نظارہ کر رہا تھا، چونک کر توپ کو فلیتہ دکھاتا ہے، وہ جان نثار بلوچ جس کا ہاتھ ابھی تک توپ کے منہ میں تھا، اپنے کئی بہادر ساتھیوں کے ساتھ جو اس کے گرد جمع ہو چکے تھے، بھک سے اُڑ جاتا ہے۔ گنبز کی اس تباہ کن لڑائی میں مریوں کی سرفروشی، جان نثاری اور بلند ہمتی کے بیسیوں ایسے بیان ملتے ہیں جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مریوں کو اس لڑائی میں شدید اتلاف جان کے بعد شکست ہوئی سینکڑوں نامدار مری کام آئے، ان کی طرف سے رحم علی بجار قوم کے نام ایک پیغام نظم کر کے کہتا ہے:-

گڑنگیں مردان رُوگاں

شوارا پول انت شاہدی
کشتگیں گورا مئے مُٹنت
نواں کنہت تی مرد، دتی
مئے سلاماں دیہت لال ءَ
تہ نواں بے ، وڑتی
پراس دیراز ہتک ودلی یار
کشتگنتان ، ھر کسی!

اے وہ جوانمردو!
جو اس لڑائی سے زندہ بچ کر جا رہے ہو۔
پوچھتے وقت
ہماری طرف سے یہ پیغام دینا تم پر لازم ہے کہ
(خون کا حساب چکاتے وقت)
صرف لڑائی میں کام آنے والے گوروں (انگریزوں) کو
ہمارے خون کا ہمپلہ قرار دینا۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دوسرے (ہندوستانی) فوجیوں کو
ہمارے برابر کے آدمی شمار کرو۔
اور ہماری پیاری بیویوں کو بھی سلام پہنچا دو اور
اُن سے کہہ دو کہ وہ مغموم نہ ہوں،
اس لڑائی میں کتنوں کے
بیٹے، بھائی، بھتیجے اور دلی دوست کام آئے ہیں۔

بالآخر انگریزوں اور مری قبیلہ کے درمیان صلح ہوئی۔ بلوچستان کے لاٹ مریوں سے صلح وانجام کرنے کاہان گئے، مری سردار اور معززین اس کے استقبال کو جمع تھے، ہر ایک سے ہاتھ ملاتے وقت لاٹ نے میر مزری خان مری مقدم سے پوچھا" میر صاحب! مری پھر کبھی سرکار سے لڑیں گے"؟ میر مزری خان نے جواب دیا" صاحب! مری نہیں لڑیں گے لیکن سرکار بھی پھر کبھی اُن سے بھرتی نہیں مانگے گا"

مارچ ۱۸۹۳ء میں بلوچستان کے خان میر خداداد خان کو گرفتار کرنے کے بعد انگریزوں نے بلوچستان کے قومی اور ملکی معاملات میں براہ راست مداخلت شروع کردی۔ قلات پر بظاہر میر محمود خان دوم بحیثیت خان حکمران تھے، لیکن درحقیقت حکومت انگریز پولٹیکل ایجنٹ کیا کرتا تھا، جس کے ماتحت متعدد دیسی افسران مامور تھے، دیوان اودھوداس نامی ایک ایسا افسر انگریزوں کی طرف سے مکران پر بحیثیت ناظم مامور تھا مکران کے بلوچ اور سردار وطن پر انگریزوں کے تسلط سے ناخوش تھے اور بغاوت کیلئے پر تول رہے تھے، کہ دیوان اُودھوداس کو اُن پر مسلط کیا گیا اودھوداس ایک انتہائی سخت گیر اور کمینہ خصلت شخص تھا، ایک مختصر عرصہ میں اس نے مکران کے باشندوں کا ناک میں دم کردیا تھا، آخر ایک دن سردار میر محراب خان گچکی اور سردار بلوچ خان نوشیروانی نے اچانک کیچ پر حملہ کرکے دیوان اُودھوداس کو گرفتار کرلیا، اس کے نتیجے میں" گوک پروش" کی مشہور جنگ لڑی گئی۔

گوک پردوش کی لڑائی پر شاعروں نے بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر بلوچی رزمیہ شاعری کی کسوٹی پہ پوری نہیں اترتیں۔ اس کی بڑی وجہ وہ خوف ہے جو اس دور کے ملا شاعروں پر طاری رہتا تھا، گوک پردوش کی نظموں میں صرف دو نظمیں ایسی ہیں جن کو کسی حد تک رزمیہ کہا جا سکتا ہے ان میں سے ایک ملک دینار میرواڑی کی ہے اگرچہ وہ بھی حکومتِ انگریزی کا ایک قصیدہ خوان سردار تھا، اور دوسری ملا ولی محمد میرواڑی کی ہے جس نے کسی قدر غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے۔

سردار ملک دینار نے اس دور کے عام رواج کے مطابق اپنی رزمیہ کی ابتدا حمدِ خدا اور نعتِ رسول سے کی ہے۔ زاں بعد بغاوت کی وجوہ، بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

گوَشتہ محراب خان گونا کیچی مرُدمان
مارا دیوان ءُ برتہ چہ شان وشنگہان
نئے حیا منتہ، نئے دِگہ ملکے رزق و نان
گیہری اَچ مرک ءَ نیست علاج مارا دُرمان

یعنی:- (سردار) محراب خان گچکی نے۔ کیچ کے آدمیوں سے کہا
دیوان (داؤد هوت) اس نے تو ہماری شان وشرف ختم کر دیا ہے
ہمارے لئے نہ حیا باقی رہا ہے
اور نہ ہی ملک، رزق اور روٹی،
موت کے بغیر
اب ہمارے لئے کوئی علاج باقی نہیں ہے۔

بلوچی کی رزمیہ نظموں میں جو جوش اور ولولہ متقدم اور متوسط دور کے شعراء کے اشعار میں پایا جاتا تھا وہ اب متأخر دور کے شعراء کی نظموں میں رفتہ رفتہ مفقود ہو چکا تھا، اب شعراء کی نظموں میں صرف لفاظی باقی رہ گئی تھی، واقعہ کا بیان اس طرح سے کیا جاتا تھا کہ جس سے انگریز حکمران ناراض نہ ہوں۔ اس لئے شعر گوئی میں رنگین بیانی، نغز گوئی، لفاظی اور دوراز کار مضمون آفرینی کے علاوہ مذہبی نگارشات کا بھی سہارا لیا جاتا تھا، اس سے نظم کی ایک ایسی صورت متشکل ہوتی تھی جو رزمیہ اور بزمیہ کے بین بین نظم کی ایک نئی صورت تھی۔ ملک دینار میروارّی کی زیر بحث نظم میں یہ نئی صورت گری نمایاں نظر آتی ہے۔ انگریزوں کے خلاف سردار محراب خان گچکی کی خفیہ تیاریوں کا ذکر وہ اس انداز سے کرتا ہے جیساکہ کوئی شکاری شکار کی تیاری کر رہا ہو۔ کہتا ہے:-

داتگی احوال پہ بلوچ خان شیر شکار
بیاکہ زر بارءَ ماکنوں ہرجا بندو بار
نہیلوں انگریزءَ بر کراچی و سندھ پار
نام مئے روت تاں لندن و ملک قندہار
مقصدی ر و چینت، ہول بیت انگریز کفار

یعنی:-

اُس نے شیروں کا شکار کرنے والے
بلوچ خان (نوشیروانی) کو اطلاع دی کہ،
آؤ! ساحلی علاقوں میں ہم لوٹ مار شروع کر دیں۔
انگریزوں کو ملک میں نہ چھوڑیں۔

انہیں کراچی اور دریائے سندھ کے اس پار پہنچا دیں
اس سے ہمیں شہرت ملے گی۔
لندن اور قندھار تک ہمارا نام جائے گا،
اِن دنوں موقع ہے
آؤ کہ انگریز کافر کو لوٹ لیں۔

کیچ میں شورش کی اطلاع جب بلوچستان کے لاٹ کو، جسے
وچ اجنٹ (ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل) کہتے تھے ملی تو اس نے ناکس (KNOX)
ی ایک انگریز افسر کو جو قلات کا پولٹیکل ایجنٹ تھا، طلب کیا ناکس کے
ف لاٹ کی جو گفتگو ہوئی اُسے بیان کرنے میں ملک دینار نے
گریزوں کی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری اور خیر خواہی کا بھرپور
ظہار کیا ہے، کہتا ہے:۔

گوَشت اجنٹ ءَ گوں ناکس ءَ: صاحب گوش بدار
گندیگہ روبایان ببرت شیرانی شکار
گرگنت دستگیر ناظم مکران آشکار!
صاحب کرنیل گوں وتی پٹوجان انت تیار
توپ و گھنبار و رفیلاں یک جاو آدار
زندکنت کیچ ءُ مسل بشامی گرتند دہار
اُش منی بھیم ءَ جنگلاں لرزنت زر مزار
سندھ و بنگالہ تانکہ دلی و زنگبار
کابلستان تن ملک غزنی و قندہار
برمنی دیما کس نہ اوشتاتہ پیدوار۔

نوں کیاکیچی مرد بنت سگنت مئے دمار

یعنی :۔

لاٹ نے ناکس سے کہا
صاحب! کان لگا کر سن لو کہ
لومڑیوں نے شیر کا شکار چھین لیا ہے
مکران کے ناظم کو
انہوں نے علی الاعلان گرفتار کر لیا ہے،
کرنیل صاحب اپنی فوجوں کے ساتھ تیار ہے،
توپ اور رائفلیں اور غبارے
اُس نے سب جمع کر لئے ہیں۔
وہ ساون کے گرجتے ہوتے بادلوں کی طرح ٹوٹ پڑے
اور سیلابی ندیوں میں اُٹھنے والی طغیانی کی طرح
کیچ کو غرق و غارت کر دے گا،
ہمارے خوف سے جنگلوں میں ببر شیر کانپتے ہیں
سندھ اور بنگال سے دِلّی اور زنجبار تک
کابل سے غزنی اور قندھار تک
ہمارے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکی ہے
اب یہ کیچ والے کون سے ایسے جوانمرد ہیں جو
ہمارا غضب برداشت کر سکیں۔

ملک دینار کے ان جزئیات کا بیان زیادہ اور اچھا
انگریزی سپاہ کی پیش رفت کی خبر سے کیچ میں جو کھلبلی مچ گ

ین کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

ناگہاں حالے اَتِ کراچی و گوادری
گرندگے سندھءِ رستگت مس لہکری
ابروا ستونان کیچیان ریسینت ساونی
ہور و ہمیر دِیِی مانند و بشامی جڑی

ترجمہ:

ناگہان، کراچی اور گوادر سے اطلاع آئی کہ
سندھ سے (انگریزی سپاہ) گرجتی ہوئی گھٹاوں کیطرح اٹھی ہے
(اس نے) ساون کے بادلوں اور کالی گھٹاوں کی طرح
بارش اور طغیانیوں کی طرح
کیچ کے باشندوں کو پسینے سے شرابور کردیا۔

ایک شاعر کی حیثیت سے ملک دینار کا شمار بلوچی کے اچھے شاعروں
ں ہوتا ہے، لفاظی اور مضمون آفرینی میں وہ یدِطولا رکھتا ہے لیکن
زمیہ گوئی میں وہ شوکتِ لفظی اور منظر کشی کی صنعت کو مبالغہ آرائی کی
ن حدوں تک پہنچا دیتا ہے جو بلوچی رزمیہ شاعری میں پسندیدہ نہیں
مجھی جاتی۔ ملک دینار بسا اوقات ان حدوں کو بھی پھلانگ لیتا ہے
س لئے اس کے بیان کو مستند خیال نہیں کیا جاتا، متقدم اور متوسط دور
کے بلوچ شاعروں میں یہ مسلمہ اصول رہا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے اشعار
یں غلط بیانی کبھی نہیں کی ہے۔ بلوچ کی طرح اس کی شاعری بھی سچائی
کا مظہر رہی ہے۔

شاعر نے جو کچھ دیکھا، سُنا اور محسوس کیا ہے اُسے سچائی اور

دیانتداری سے من وعن البتہ شاعرانہ زبان اور دلکش پیرایے میں بیا
کیا ہے، لیکن ملک دینار اور اس دور متاخر کے بعض دوسرے شعر
اس اصول کو نظر انداز کرتے رہے ہیں اس لئے ان کی رزمیہ نظمیں
دلوں کو نہیں لگتیں

مکران کی بغاوت کو کچلنے کیلئے انگریزی سپاہ کراچی سے بح
جہاز کے ذریعے روانہ ہو کر پسنی کی بندرگاہ پر اتری اور دوسرے دن
کی طرف آگے بڑھنے لگی، گوک پروش کے مقام پر بلوچ مجاہدوں
لشکر سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ میدان جنگ کا نقشہ کھینچتے ہوئے ملک
دینار کہتا ہے:۔

ہردَوئین پہ ئُو جان بو تگنت یکت جا وَ وار
روشنین روچ ءَ را ہمایکدم گپت گُبار
گوں دم صحبُ ءَ، توپک و توپانی توار
سادَنی ہیردپ و مُجان، آسمان بوت تہار
چنڈگ وُجنبگ زرتگنت اَرض وکوہسار
گریشک پہ شیروجنگل ءَ ببری داوَ زار
دہشت ترس ءَ زرت جہان گوُتہ برقرار
پریشتگ پہ آسمان ءَ دریءَ نشتگ انتظار
حورُ وغلمان پہ جنّتی سامان ئنت تیار
کوثرءِ جو ودرخت طوبٰا پہ انتظار
سرچم ءِ مستاگنت شہیدانی، دوست دیار

یعنی:۔

دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں
آن کی آن میں
چمکتے سورج پر غبار چھا گیا،
صبح دم کے ساتھ،
توپوں اور بندوقوں کی آوازیں گونج اٹھیں
ساون کی طغیان بردوش ہواؤں کی طرح
آسمان پر تاریکی پھیل گئی۔
زمین اور پہاڑ ہلنے اور کانپنے لگے۔
میدانوں میں شیر
اور جنگلوں میں ببر شیر زاری و فریاد کرنے لگے۔
دہشت اور خوف سے ہر طرف سناٹا چھا گیا،
آسمان کے دروازے پر
فرشتے انتظار میں آکر بیٹھ گئے
حور و غلمان جنت میں (شہیدوں کے لئے) انتظام کرنے لگے
اور، کوثر کی ندی اور طوبیٰ کے درخت کے نیچے
(شہیدوں کے) انتظار میں آکر بیٹھ گئے
یہ سب شہیدوں کے دوست اور یار ہیں
اور اُن کو انعام میں دیئے جائیں گے

بلوچی رزمیہ شاعری کے عام دستور کے مطابق ملک دینار نے بھی اُن
سرفروشوں کی نام لے لے کر تعریف کی ہے جو مردانہ وار لڑتے ہوئے میدان

جنگ میں کام آئے۔میر بلوچ خان نوشیروانی جو اس لڑائی کے سرغنوں میں سے ایک تھا نہایت بہادری سے لڑا اور شہید ہوا۔ دینار کہتا ہے:۔

زرتہ شہیدی ءَ دراول محراب کیان
عطر ؤ شبوئی مشتگ فردوس آشیان
زہم کتہ نر شیرین بلوچ خان پہلوان
چو رستم ذال ءَ کشتہ شمشیر از میان
چند قدم دیما رتگت، شیرین سیاہ جگر
رھیتگنت تیران بر سرد جان ءَ چو مطر
عبرتے گپتگ پرشتگ و جن وہم بشر
کس گو نے شاہان نہ کنت جنگ ءَ اینقدر
تیری شش ماں نت رتگت دیما شیر نر
نعرہ دگھران ءَ شترہ، چو ش کہ پیل در
سیتمی تیر ءَ بر سردیم ءَ کرت گذر
رستگت ہتیات عرش و آسمان ءَ بے قدر
ناگہ جن د پرشتگ د مخلوق ءَ ستر
مات نہ کنت پیدا ہمچشین فرزند ءَ دگر
بر تگنت حوران جنت الفردوس ءَ بہ سر

یعنی ار سب سے پہلے محراب خان (نوشیروانی) نے شہیدی حا
وہ فردوس آشیاں اپنے جسم پہ

عطر اور خوشبو مل کر (میدان جنگ میں) آیا تھا،
پھر بلوچ خان (نوشیروانی) نے
ایک شیر نر کی طرح تلوار میان سے نکال لی۔
اور رستم ذال کی طرح حملہ کر دیا،
یہ سیاہ جگر شیر ابھی چند قدم ہی گیا تھا کہ
اُس کے سر اور جسم پر بارش کی بوندوں کی طرح
گولیاں برسنے لگیں،
اُس (کی جرأت) پر فرشتے، جن اور انس حیران رہ گئے۔
اِس (انگریز) بادشاہ کے ساتھ کون ایسی لڑائی لڑ سکتا ہے
چھ گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوگئیں
لیکن وہ شیر نر پھر بھی
جنگلی ہاتھی کیطرح چنگھاڑتا اور آگے بڑھتا رہا۔
(تا آنکہ) ساتویں گولی اس کے سر کے پار گذر گئی۔
عرشِ آسمان، شور ہیہات سے گونج اٹھا
جن اور فرشتے اور دوسری مخلوقات نے زیادہ فریاد کی
ماں اُس جیسا بیٹا پھر نہیں جنیگی۔
حوریں اُسے سر پر اٹھا کر
جنت الفردوس میں لے گئیں۔

اِسی انداز سے ملک دینار اُن دوسرے بہادر بلوچوں کی بھی تعریف
کے جو اس لڑائی میں کام آئے، لیکن اُس کے اشعار میں شہیدوں کے

لیئے وہ تڑپ اور ولولہ نہیں جو ایک ایسی رزمیہ نظم میں ہونا چاہیئے ملک
دینار شہیدوں کو بہشت اور حور و غلمان کی بشارت دیکر اپنے فرض سے
دستکش ہوجاتا ہے۔ اور یہ اس دَور کے رزمیہ گو شاعروں کا ایک
طرزِ بیان تھا، انگریز حکمرانوں کے عتاب سے بچنے کی ایک مذہبی آڑ تھی
اُن کی نظموں میں آئندہ نسلوں کے لیئے کوئی پیغام نہیں، جان نثاری
سرفروشی کی کوئی تحریک نہیں۔ قوم، وطن اور آزادی کا کوئی ذکر نہیں محض
جان دینے کا ایک بے جان بیان ہے۔ جسے اگر کوئی گویا گا کر سنائے تو
شاید اُس سے شہیدوں کے لیئے افسوس و ارمان کا جذبہ پیدا ہو ورنہ ایک
سپاٹ داستان ہے جو سوائے تاریخی یادداشت کے اور کسی مصرف
کی نہیں۔

ملک دینار جنگِ گوک پروش کے دوسرے شہیدوں کو خراج عقیدت
پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

روستم و گل محمد بُزُرت وش نامی کبیر
دنت خدا دیدا جنت ءِ حوران ذرق و سیر
میر مہیم خان ءُ مشتگت عطران گوں عبیر
میرین شکر اللہ چُکی شیرین' بیر گیر'
ہم رفیقی ءُ رفتنت پہ فردوس منیر
رند حیاتان بوت گوں وتی ہمراہان شہید
نام دشبوئین اشتہ تاں قیامت ءُ سعید

یعنی:۔

روستم اور گل محمد نے بڑی نیک نامی پائی

خداوندِ تعالیٰ انہیں جنت میں
حوروں سے بیاہ دے کر محفوظ فرمائیں گے
میر مہیم خان نے اپنے جسم پر عطر و عبیر ملا تھا،
میر شکر اللہ کچکی جو شیر کی طرح بہادر اور منتقم تھا
اپنے رفیقوں کے ساتھ یکجا درخشندہ فردوس میں داخل ہوا
حیاتان رند بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہید ہوا۔
اس نے دنیا میں ایک ایسا مبارک نام چھوڑا۔
جو قیامت تک (یادوں میں) معطر رہے گا

اس لڑائی میں کتنے بلوچ شہید ہوئے، ملک دینار ایک شعر میں ان کی تعداد ایک ایسے انداز سے بتاتا ہے جس سے انگریزوں کی بالادستی اور تعریف کا اظہار ہوتا ہے۔ کہتا ہے:۔

صاحب کرنیل اور اجنٹ ناکس صاحبان
یکصد و ہشتاد کشتنت اُچ قومِ سُنّیان

یعنی:۔
جناب کرنیل صاحب اور پولیٹیکل ایجنٹ ناکس صاحب نے
سُنّیوں کی قوم سے
ایک سو اسی آدمی مار ڈالے۔

انگریزوں کی طرف سے کتنے سپاہی مرے؟ اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھا گیا،

گوک پروش کی اس لڑائی پر دوسری قابل ذکر نظم ملا ولی محمد میر واڑی کی ہے۔ ملا ولی محمد کی نظم بھی اگرچہ بلوچی رزمیہ نظموں کی سطح کی

نہیں مگر بعض صورتوں میں ملک دینار کی نظم سے بہتر ہے۔ اس کی نظم میں انگریز حکمرانوں سے خوف کم اور قومی جذبے کا اظہار کسی قدر پایا جاتا ہے، جزئیات کا بیان اور منظر کشی زیادہ روشن اور مؤثر ہے۔ اس لئے کہ شاعر خود لڑائی میں شامل رہا ہے۔ کہتا ہے:-

گُڈ اپے حمد و ثناءَ من بگویم قصّہے
پہ زر زوالیں شیر شکارءُ شیر وگال ءِ حصّہے
شا جنابیں پہلوانءُ من دل ءِ داشت غصّہے
اش ابتدا تاں انتہا وت سنگتت من بندئے

یعنی:-

حمد و ثنائے (خداوند تعالیٰ) کے بعد
میں ایک قصّہ بیان کروں گا
اُس دولت لٹانے والے اور شیروں کا شکار کرنے والے[1] کیلئے
اپنے اشعار و گفتار کا ایک حصّہ نذر کروں گا،
گو کہ اس عالی جناب پہلوان سے میں دل میں غصّہ رکھتا تھا،
لیکن، اس کے باوجود (اس لڑائی میں)
ابتدا سے انتہا تک بندہ ان کے ساتھ رہا۔

ملا ولی محمد اپنی نظم میں دونوں متحارب فریقوں کو شاعرانہ تصور کے ترازو میں تولتا ہوا اپنی گفتار کا جلوہ دکھاتا ہے۔ مکران میں آزادی خواہ مجاہدین کی شورش کا سنکر انگریز غضبناک ہوجاتے ہیں اور ایک بہت بڑی فوج لے کر مکران پر حملہ لے آتے ہیں۔ ملا ولی محمد اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

---

[1] میر بلوچ خان نوشیروانی۔

اُش چُما لاہور و ملتان جھنگ شاہِ پرنگ
زرتگنتی پُوج و پلٹن آہتہ پہ اومیتی جنگ !
سوار بُوت ما بگوٹ ءُ زُوتی چکھت بندر ءُ لنگ
دم بہ دم بہر صُحب و شام ءَ وار تگنتی جام و بھنگ
ساستی اسباپ شاہی گون اَتنتی رنگ پہ رنگ

یعنی:-

لاہور اور ملتان سے شاہِ فرنگ بھیج کر اٹھا
فوج اور پلٹن ساتھ لے کر
لڑائی کے ارادے سے وہ روانہ ہوا،
آگبوٹ پر سوار ہو کر،
بہت جلد زنجیروں والا لنگر اٹھایا،
صبح اور شام کو وہ
دم بہ دم شراب اور بھنگ پیا کرتے تھے،
طرح طرح کا شاہانہ سامان جنگ ان کے ساتھ تھا،

بالآخر انگریزی یہ فوج کرنل مین (Mein) کی زیر کمان اور مسٹر ناکس پولٹیکل ایجنٹ کی زیر ہدایات بلوچستان کے ساحل پر اتر جاتی ہے۔ مُلّا ولی محمد انگریزی فوج کے پسنی کی بندرگاہ پر اترنے کا نقشہ اسطرح کھینچتا ہے:-

سے و چار ایام کہ گوستہ بُوتہ داخل پسنی
توپ و غنبارہ [1] ملوکی ساز و سامان آہنی
پلٹن و پیش خانہ رفتنت دیم پہ مکران زمین

---

[1] دُخانی جہاز۔

کافرین ناکس پلیت ءَ کرتہ ادراک بر جبین
گوں وَتی بیل ورفیقاں گوں کشتہ انگریزءَ ہمیں
بدرالدیارِن یا فرارن یاکہ محبوس ، بندزین

یعنی :- تین چار دن گذرنے کے بعد
وہ پسنی کی بندرگاہ میں داخل ہوئے۔
اپنی توپیں ، شاہی مختیارے
اور آہنی ساز وسامان اُتار لئے
پھر اُن کی پلٹن اور پیش خانے مکران (کیچ) کیطرف روانہ ہوئے
اُس پلید اور کافر انگریز ناکس نے چہرے پر بل لاکر
اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے کہا کہ
(باغیوں کا) قتل عام کردو ، ملک سے اُن کو بھگا دو،
یا گرفتار کرکے فتراک زین سے باندھ دو۔

بلوچ لشکر کو، پسنی کی بندرگاہ پر انگریزی فوج کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی، ملا ولی محمد نے بعض شاعرانہ کوتاہیوں کے باوجود کچھ اچھے اشعار کہے ہیں اُن میں تاثر اگرچہ زیادہ نہیں لیکن نظم کی روانی اور سلاست اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ انگریزی فوج کی آمد کی اطلاع پاکر میر بلوچ خان نوشیروانی پر جو کیفیت گذری اس پر روشنی ڈالتے ہوتے ملا ولی محمد کہتا ہے:

ناگہاں وقتِ سحارءَ اَشتگت حالے شتاب
اَش خانِ محراب قوم گچکی داتہ پیغام وجواب

پرغضب جہت مزار ءَ پادی ششپنہ درر کاب
بر چیذ بین زین ءَ قرارت درورِی عالی جناب
دیمی داشت بر ملک ریکچ ءَ رفتگت جلدی شتاب
ھاری ملّاں ءَ برفتہ زمجنوکیں سر متاب
صاحب جمالیں گچکی ءَ کرتہ عساکر بے حساب
لرزتنت بدخواہیں دشمن جوریں بدنیت اباب
اچانک علی الصبح جلدی میں ایک اطلاع آئی
جو محراب خان گچکی کی طرف سے ایک جواب طلب پیغام تھا
پیغام سنکر وہ شیر (بلوچ خان) بپھر کر اُٹھا
اور رکاب میں پاؤں ڈال کر وہ عالی جناب
چندن کی زین پر آرام سے بیٹھ گیا،
اور ریکچ کی طرف رُخ کرکے
مشکلات سے منہ نہ موڑنے والا وہ شمشیر زن
سیلاب کی طرح روانہ ہوا،
(ریکچ میں) اس صاحب جمال گچکی (محراب خان) نے
ایک بہت بڑا اور بے حساب لشکر جمع کیا تھا،
جسے دیکھ کر اُن کی برائی چاہنے والے کانپتے تھے
اور بری نیتوں والے زہریلے لوگوں کا دل کباب ہو رہا تھا،
میدان جنگ کی منظر کشی میں ملا ولی محمد کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے
کہتا ہے:- رُوبرو بوتنت مقابل ہردو لشکر جانبین
اَچ تو پک و توپ ءَ ہزیم ءَ لرزتھا بوت زمین

اَچ ہما خون دیراں ارض گشتہ گل چگین

پریشتگاں والسمٰوٰت کرتہ صد بر آفرین

یعنی دونوں لشکر آمنے سامنے ایک دوسرے کے بالمقابل آ

بندوقوں اور توپوں کی دہشت سے

زمین سمٹ کر کالی پڑ گئی

دیروں کے خون سے زمین رنگین ہو گئی

آسمان کے فرشتوں نے اُن پر سو بار آفرین کہا

لڑائی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ملا ولی محمد کہتا ہے:۔

یکہزار دسے صد ۱۳۱۵ھ دپانزدہ ہجری در حساب

ماہ رمضان نوتکت کہ نوشتنت شہد و شراب

یعنی:۔ ایک ہزار اور تین سو پندرہ ہجری کا سن

اور رمضان کا مہینہ تھا،

جب انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔

بلوچوں کی لڑائیاں انگریزوں کے علاوہ حکومت ایران کے ساتھ

ہوئی ہیں بلوچستان کا وہ وسیع علاقہ جو آج کل ایرانی بلوچستان کہا

ہے ایسے وطن دوست اور قوم پرست بلوچ بہادروں کا گہوارہ رہا ہے

اپنی آزادی کے لئے ہر دور میں بادشاہوں اور جابر حکمرانوں سے ٹکرا

رہے ہیں۔ ایران کی قدیم و جدید تاریخ اس کے باوجود کہ تعصب و تنگ نظر

ے آلودہ و آشفتہ ہے ان بلوچوں کے ذکر سے بے نیازی نہیں برت سکی ہے ،
جنہوں نے ہر ہر موقع پر اس کے اقتدار اعلیٰ کو للکارا ہے۔ یہاں تک کہ
رضا شاہ کبیر کے عہد میں بھی کئی ایسے واقعات ہوتے ہیں جن میں ایرانی
سپاہ نے آزادی خواہ بلوچوں کے خلاف جارحانہ اقدامات کئے ہیں زیر
بحث رزمیہ نظم جو گواہرام نامی ایک بلوچ کی تصنیف ہے ایک ایسی لڑائی
ے متعلق ہے جو رضا شاہ کبیر کے عہد میں بلوچوں کے خلاف لڑی گئی۔

بلوچوں کی خود سری اور بیباکی سے پریشان ہوکر رضا شاہ کبیر نے
تمام بلوچوں سے ہتھیار چھیننے اور ضبط کرنے کا فرمان جاری کر دیا ایرانی سپاہ
کا ایک دستہ جو اس امر پہ مامور تھا میر ہوتی دینارزئی بلوچ پر چڑھ دوڑا
میر ہوتی مورتان کا جو علاقہ سرباز میں واقع ہے سردار تھا ، اس نے ایرانی ضابط
کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں یہ لڑائی واقع ہوئی

گواہرام نے نظم کی ابتدا اس دور کے عام شاعروں کی روش کے مطابق
نعتیہ کلام سے کی ہے ، زاں بعد گردش دوران کا گلہ کرتے ہوئے کہتا ہے

سر چہ عجیب انت چہ آخری دور د یاریان
سرنگون انت دنیا چہ بازیں گردشان
سر منی ایر مانت چرے ظلماتیں گھمان !
پہ ہمک رنگ ءَ دیستگاں دنیا و جہان
گاہے چو زوک سیر ءَ پری بندیت زیب وشان
گاہے پہ جنگ ءَ دنتی گوں بے سوبیں دہان
وش آتنت مرد وش آتنت مردانی زمان
وش ئت ہما دور کہ زندگ ئت میریں ہوتی خان

یعنی:- مجھے یہ آخری زمانہ اور اس کے حالات دیکھ کر تعجب آتا ہے

دنیا، انقلابات کی کثرت سے سرنگوں ہو چکی ہے۔

میرا سر غموں کی ظلمات میں پڑ کر جھک گیا ہے۔

میں نے اس دُنیا کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔

کبھی یہ دلہن کی طرح زیب و زینت سے

اپنے کو سنگھار کرتی ہے۔

اور کبھی یہ حرافہ اپنے پرستاروں کو

نامعقول دیوؤں کے ساتھ لڑا دیتی ہے۔

اچھے تھے وہ لوگ اور اچھا تھا، اُن لوگوں کا زمانہ

اور اچھا تھا وہ وقت جب میر ہوتی خان زندہ تھے۔

گلۂ دوران کے بعد اب شاعر اصل مضمون کی طرف آتا ہے اسکی زبا
فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ کا ایک رنگین پیکر ہے۔ جیسے اس دَور کے بڑے
بڑے شاعر اپنا طرۂ امتیاز خیال کیا کرتے تھے، سلاست و فصاحت کی بجا
ثقالت و لفاظی کو شاعری کا کمال سمجھا جاتا تھا، ملا فاضل رند اور اس
پیروی میں بعض دوسرے مشہور شاعر ایسے اشعار کہتے تھے جن کے معنی سمج
کے لئے سامعین کو کسی استاد کی ضرورت پڑتی تھی لیکن اس کے باوجود
ایسے ذو معنی اور دقیق اشعار کو سراہا اور پسند کیا جاتا تھا۔

شاعر گوا سرام کہتا ہے کہ اچانک ایک دن ایرانی سپاہ نے میر
ہوتی خان کو بے خبری کے عالم میں ان کے مکان میں گھیر لیا اور:-

مورتان سانگیت ہوتی، گوں جنگ دوتیں یلان

شش دریں ارگھ ءَ نشتگ بے شک و گمان
فوج حکومانی چپ و راست جیتگنت پر عنان
سنگر و جنگجا گپتگنت ظلم ءِ عسکران
توار کتگ ضابط کہ کتام مردینت ہوتی خان
حکم و اعلانوں گون اِنت چہ شاہی دفتران
حق و ناحق ءَ من تئی دھتیراں براں!

ہوتی خان اپنے جنگجو ساتھیوں کے ساتھ مورتان میں موجود
اور اپنی چھ دریچوں والی ماڑی میں بے خبر بیٹھا ہوا تھا،
جبکہ اچانک حکومت کی فوج نے دائیں بائیں پھیل کر
انہیں گھیرے میں لے لیا،
اور ظلم ڈھانے والے فوجیوں نے مورچے سنبھال لئے
تب ضابطہ[۱] نے آواز دی کہ
ہوتی خان تم میں سے کون سا ہے (باہر آئے) کہ
شاہی دفتر سے حکم اور بادشاہ کا اعلان ہم ساتھ لائے ہیں۔
(اس حکم کی تعمیل میں) جائز یا ناجائز جیسے بھی ممکن ہو۔
ہم تمھاری دھتیر[۲] بندوقیں لے جائیں گے۔

میر ہوتی خان اپنے علاقے کا ایک باعزت اور نامدار بلوچ تھا۔ یہ
بات اس کیلئے باعث عار تھی کہ بغیر لڑے بھڑے اُس کے ہتھیار چھین لئے
جاتے اگر ان ہتھیار دل سے وہ اپنی عزت و ناموس کی حفاظت نہیں کرسکتا تو

---

۱ ایرانی سول افسر۔ ۲ دس گولیوں والی بندوق پ ۳۰۳

پھر اس نے یہ ہتھیار اپنے پاس رکھے کس لئے تھے، ایک شریف اور بہادر
کے ہتھیار اس سے جیتے جی چھین لینا آسان نہیں ہوتا، میر ہوتی خان نے
کو جواب دیا کہ:-

زندگ ءَ سنجانی برگ سکنت پہ گمان!
بے دتی کوشش ءَ چون ترا دھتیراں دیان

یعنی:-

میری زندگی میں ہتھیاروں کا لے جانا
میرے خیال میں تمھارے لئے بہت مشکل ہے
میں اپنی زندگی میں
اپنی دھتیری بندوقیں تمھیں کیسے دے سکتا ہوں۔
میری موت کے بعد لے جانا،

اس سوال و جواب کے بعد بازار کارزار گرم ہوا، شاعر نے لڑائی کی منظر
سے زیادہ جنگجوؤں کے خیالات و جذبات کے اظہار پر زور دیا ہے۔ اور ان
بہادر بلوچوں کا نام بنام ذکر کیا ہے جو میر ہوتی کے ساتھ اس لڑائی میں
کہتا ہے:-

اڑ دو دیمیگءَ لگیتگ مردان زین وزیان
گمگگ راجی مان گگگ زلیتن درنایان
گونڈلان شینگینتگ منی شیریں ورکیان
پہ زبان گال آتکہ منی میریں کدخان
قادروں پشت بی' ہوتی اتئی پوتانی ڈاھوکتہ بان
گلہ وزنگان گوں کتام وت سیادان کنان
زُمبگ سیا ہماری چدان جتینت ریس گران

یک انا گاہے چاپ جنگ پتان یکبرؤ
للہ و خیراللہ جنگ ءَ کپتنت مں پڑءَ
ہر سیمی ایرنت جنتی بزبانی سرءَ
پہ شہیدیءَ داتگنت شاہیں قادرءَ
مسک و عطار نت نامش مں شاہانی درءَ

معنی :-

دونوں طرف سے جوانمردوں نے
ایک دوسرے کو نقصان جان پہنچانے کی کوششیں شروع کیں
بہادر نوجوانوں نے قوم میں ہلچل مچادی۔
گولیوں نے میرے شیر اور شاہی موتی (ہوتی) کو
چھلنی کرکے پھینک دیا،
اس وقت میر للہ خان نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا
ہوتی ! خدا میری مدد کرے۔ میں تمہارے رشتہ داروں کو،
تمہاری موت کی خبر پہنچانے کو زندہ نہیں رہوں گا
تمہارے بعد زندہ رہ کر،
میں اپنے اور کون سے رشتہ داروں کے پاس بیٹھ کر تمہارا ماتم کرونگا
اتنا کہہ کر وہ نرچیتا
کالے ناگ کی طرح غصے سے بل کھاتا ہوا
دشمن پر جھپٹ پڑا۔
اچانک بندوقیں ایک ساتھ بجلی کیطرح کڑکنے لگیں۔
للہ اور خیراللہ ایک ساتھ جوڑی بن کر میدان میں لڑے۔

اور ساون کے بادلوں کی طرح
دمبدم جوش سے بل کھاتے ہوئے جھپٹتے رہے
انھوں نے میدانوں اور کھیتوں کو
تیزی سے پار کیا۔
ایک کھلے میدان میں آ کر دشمنوں سے اُن کی مڈبھیڑ ہوئی۔

بلوچوں میں اب تک للکارے بغیر دشمن پر وار کرنا عیب کی بات سمجھی جاتی ہے شاعر
کو اس کا علم تھا، اس نے کہا ہے:۔

تو ارکتہ گواہرام! ضابطا! وتی واگاں بدار
سوب ترا گون انت۔ تو مجواڑ من بے خیال

یعنی:۔ گواہرام نے اب للکار کر کہا:
ضابطہ! اپنے گھوڑے کی باگ اب کھینچ لے۔
جیت تمھاری ہوئی ہے لیکن،
مجھے بھول کر مت جاؤ۔

شاعر کہتا ہے کہ للکارتے ہی میر گواہرام نے گولی چلا دی۔ اور ضابطہ زین سے
لڑھک گیا،

پیچگی درھنزت وتی دیر مالیں تمار
نین شکست جنگ ضابطا شنزین ءَ چندین
گونڈلان شینگینتہ شنگھال ءَ ء زیندا درین
بہُرنہ نیدسے کہ مٹے منی جان ءَ برادرین

یعنی:۔ اُس نے اپنی دور مار کرنے والی بندوق
پنجے میں جھپٹ لی۔

ضابطا گھوڑے کی چندنی زین سے نیچے ڈھلک گیا
زین پر بیٹھے ہوئے اس گیدڑ کو
گولیوں نے اُدھیڑ کر پھینک دیا،
ضابطا ! اب تم اپنی جیت پر فخر نہیں کرو گے
تم میری جان سے عزیز دوست کا عوض ہو
میر گواہرام نے کہا !

اب دونوں طرف سے گولیاں برسنے لگیں، میر گواہرام اور اُس کے ساتھی بغیر کسی آڑ کے صاف میدان میں لڑ رہے تھے، دوسری طرف ایرانی سپاہ تھی جو اس وقت تک آڑ لیکر لڑنے کو تیار ہو چکی تھی۔ میر گواہرام اور اس کے ساتھی ضابط کو مار ڈالنے کے بعد اگر چاہتے تو نکل سکتے تھے، لیکن درند نہ کنزنت چہ موزگی پینشر، رند میدان جنگ سے اپنی ایڑی بھی پیچھے نہیں ہٹاتے۔ تینوں بہادر اور قابل فخر نوجوان میدان جنگ میں ڈٹ گئے شاعر کہتا ہے:۔

چپ و راستیگۓ گپتگش گواہرام ءَ بلین
چاپ جتہ نپتان رنگنت پولات ترونگلین
تیری دارت گواہرام من آ، ناراہ ءَ پرٹین !
دُر تقائیں حُوران برتنتش جنت ءَ گلین !

لیعنی ا۔

اب انہوں نے دائیں بائیں سے گواہرام کو گھیر لیا،
بندوقیں ناچنے لگیں اور سیسے کے اولے پڑنے لگے،
گواہرام کو گولی لگی
اور وہ اُس ویران میدان میں گرا۔

موتی جیسے چہروں والی حُوریں اُسے اُٹھا کر
پھولوں والی بہشت میں لے گئیں۔

میر گواہرام کے ساتھیوں میں سے شاعر کہتا ہے روشن بھی خُوب لڑا لیکن :-

جنگ کتہ روشن خان ہما روچی چند بار
بادشاہاں گوں جنگ نہ بیت، مرد نیست تیار
غیری گواہرام و دلمتر سیں، توکل بکار
ملتے کہ، نپچے ءَ بنا زینیت چند بار
نہیکہ چہ گواہرام ءَ گو تزیت مرد پہ اعتبار

یعنی :-

روشن خان اُس دن کئی بار اُن سے لڑا۔
لیکن اس جوانمرد کا کوئی قصُور نہیں۔
بادشاہوں کے ساتھ لڑائی نہیں ہو سکتی
اُس نڈر، باہمت اور توکل سے کام لینے والے گواہرام کے سوا،
دادر کسے بادشاہ سے لڑنے کی ہمت ہوتی ہے)،
کوئی ماں اپنے بیٹے کی جتنی بھی تعریف کرے۔
وہ بہادری اور سنگداری کے اعتبار سے
میر گواہرام سے بہتر نہیں ہو سکتا،

بلوچستان کے غیور فرزند ہر موقع و محل پر اپنی آزادی و خود اختیاری کیلئے قربانیاں دیتے چلے آرہے ہیں۔ دولتِ ایران متعدد بار بلوچوں پر فوج کشی کر کے انہیں تاخت و تاراج کرتی رہی ہے، بلوچ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اپنی

ی سرزمین سے نقل مکانی کر کے آج کراچی و سندھ میں جسطرح خوار و منتشر نظر ے ہیں وہ ان ہی شاہانہ تاخت و تاراج کے نتائج ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ایک طرف سے انگریزوں کی یلغار اور دوسری ف سے ایرانی بادشاہوں کی ستم رانیاں بلوچوں کو سامراجی چکی کے دو پاٹوں چ پلتی رہیں لیکن اس کے باوجود ایشیا کی یہ سخت جان و سخت کوش قوم اب ں اپنا وجود قائم رکھ سکی ہے جو اُس کی قومی حمیت اور جذبہ آزادی کے انہدام یری کا بین ثبوت ہے۔ بعض مؤرخ اور سیاست مدار بلوچوں کے اس جذبے اُن کی مُہم جویانہ فطرت (warlike habits) کا اثر کہہ کر ایک طرح سے نظرانداز کر ا چاہتے ہیں اور بزعمِ خود بلوچ کو ایک رو بہ زوال قومیت کے پرستار قرار یتے ہیں اور اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر بلوچوں کی سرزمین کو جو قدرتی خزائن ے مالا مال ہے۔ اپنے تصرف میں لے آنا چاہتے ہیں۔ لیکن بلوچ کی رزمیہ تاریخ جس ایک جھلک ان رزمیہ نظموں میں نظر آتی ہے ان کے اس مفروضے کو جھٹلاتی اور لندہ کر دیتی ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو سامراجی دنیا کے یہ مست ہاتھی چنگھاڑ چنگھاڑ کر بلوچوں کو کوستے اور شرپسندی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔

ایرانی بلوچستان میں میر دوست محمد خان باران زئی بھمپور کا بلوچ اور م علاقے کا ایک باثروت و با اقتدار سردار تھا، رضا شاہ کبیر نے اُسے زیر نے کیلئے ہر طرح کے ظاہری و باطنی جتن کئے، لیکن یہ قوم پرست اور غیور، چ سردار اُس کے قبضے میں نہیں آیا بلکہ اس کے برعکس ایرانی بلوچستان میں ردار دوست محمد خان نے اپنی ایک نیم خود مختار حکومت قائم کر لی۔

بالآخر شاہ ایران نے سردار دوست محمد خان باران زئی کے خلاف ے پیمانے پر فوج کشی کی۔ سردار دوست محمد خان اور ایرانی حملہ آور سپاہ

کے درمیان متعدد لڑائیاں لڑی گئیں۔ زیرِ بحث نظم اس سلسلے کی اس لڑ
سے متعلق ہے جس میں سردار دوست محمد خان باران زئی شکست کھا کر گ
ہوئے اور اس کے کئی بہادر ساتھی میدانِ جنگ میں کام آئے۔

اس رزمیہ نظم کا مصنف جیسو یا یوسف نامی ایک مشہور بلوچ شاع
نظم کی ابتدا اس دور کے شاعروں کے عام رواج کے مطابق نعتیہ اشعار
ہوتی ہے۔ زاں بعد نفسِ مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جیسو کہتا ہے

نو کپین احوالے اُشکنگ منی گوشاں ناگہان
جہجنگ پٹو جان اَچ ہما ایرانی دران
چو زری لہراں ماں پردشاں بوتنت رواں
تیہر و جنپاں بو تگنت چو ہاری گلان
جوش درانی ءَ دیم پما باگہیں مکّران
دزک و بھمپورءُ گتنت تھامور دمجان

یعنی:۔

میرے کانوں نے اچانک ایک خبر سنی ہے کہ
ایران سے فوجیں بھپر کر اٹھی ہیں۔
اور سمندر کی موجوں کی طرح
ٹوٹتی اور بڑھتی چلی آ رہی ہیں۔
گھاٹیوں اور پہاڑوں پر سے سیلاب کی طرح گذر رہی ہیں۔
اور پُر جوش لہروں کی طرح
باغوں والے مکران کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہیں۔
دزک اور بھمپور کے علاقے

اُن کی تاخت و تاراج کا شکار ہو کر
تاریک گرد و غبار میں چھپ گئے ہیں۔

جیبو کی زبان نسبتاً صاف ہے۔ ایران سے قربت رکھنے کے باوجود اُس نے
نظومات میں فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال نہیں کئے ہیں۔ جیبو فصاحت و بلاغت
بھی اس دور کے فارسی آمیز زبان استعمال کرنے والے شاعروں کے پایہ سے
ہے۔ جزئیات کے بیان اور منظر کشی میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اور اپنے
رعین کی دلی کیفیت اور جذباتی کلام کی عکاسی نہایت خوبصورت الفاظ میں
ں کی بھی مہارت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایرانی سپاہ سردار دوست
یان باران زئی کے علاقے میں داخل ہوتی ہے۔ تو حملہ کرنے سے قبل سردار
ت محمد خان کو ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کی جاتی ہے۔ بقولِ جیبو:-

قاصدے راھداتنت ہما شاہ ءِ معتبران
بُرتگ و معلوم دارکتنت شیریں نوجوان
دوست محمد سردار ءَ سخی شاہانی نشان
چست داشتاپ ءَ اے ربکپ برزیں گوانگران
یا بکن جنگے بیا، گو ترسے ایرانی نران

شاہِ (ایران) کے افسروں نے ایک قاصد بھیجا
قاصد نے جا کر اس شیر جیسے نوجوان کو
سردار دوست محمد کو
جو سخی اور شاہانہ نشان رکھتا تھا، اطلاع دی کہ
یا تو ہتھیار ڈال دو یا پھر ... مقابلے (کے لئے تیار ہو جاؤ) یا تو ہپنے اونچے بادگیر سے

جلدی اور فوراً نیچے اُتر کر ہتھیار ڈال دو
یا پھر ایرانی بہادروں سے لڑنے کیلئے تیار ہوجاؤ۔

حکومت ایران بلوچوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کرتی تھی اور جس طرح ان کی آزادی سلب کرکے انہیں غلاموں کا غلام بنانے کے درپے تھی، سردار دوست محمد خان اور دوسرے بلوچوں کو معلوم تھا، اس نے اپنے جائز حقوق کے لئے دولت ایران کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے، اس طرح کی دھمکیوں سے جابرانہ طاقت کے سامنے ہتھیار ڈالنا اس کے لئے اب ممکن نہ تھا چنانچہ اس نے ایک بہادر بلوچ کیطرح شاہ ایران کے افسروں کو جواب دیا کہ

نے من ءَ پرواہ ، پرتئی سانڈھی دریگان
گرمن ءَ توفیقے بدنت شاہین مہربان
دلسریں جنگے ، گوں تئی پٹو جان من کنان

یعنی:- مجھے تمھارے سانڈوں کی طرح گرجنے کی پرواہ نہیں
اگر وہ بادشاہ مہربان (خداوند تعالےٰ) مجھے توفیق دے
میں ایک ایسی لڑائی لڑ کر دکھاؤں گا
کہ تمھارے دل ٹھنڈے ہو جائیں گے،

سردار دوست محمد خان کا جواب پاکر ایرانی سپہ سالار نے حملے کا حکم دے دیا۔ شاعر نے صرف تین شعروں میں اس منظر کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہتا ہے:-

بنیڈ وباجیگان گھرّتنت طبلان در زمان
بیتگنت پٹو جان بجو تہار دمین جمّران

من سرءِ بانگیں نمراب گردوہاں ودان

اُسی وقت بینڈ، باجے اور طبل جنگ غرانے لگے
فوجیں بچھرے ہوئے کالے بادلوں کی طرح صف بستہ ہوگئیں۔
اُن کے سروں کے اوپر ہوائی جہاز چکر کاٹنے لگے

بیو غالباً پہلا رزمیہ گو شاعر ہے جس نے بینڈ، باجا اور ہوائی جہازوں
کیا ہے، جیبو کی ہی نظم میں ہمیں پہلی بار بلوچوں کے مورچے سنبھالنے
لتا ہے. کہتا ہے:-

جنگی دانایاں گپتگنت بوم ءَ زیب وشان
رونکے نوجوانوں نے زیب وشان سے مورچے سنبھال لئے۔

اس دور میں بھی جبکہ بندوقوں اور مشین گنوں سے میدانِ جنگ میں
طور پر کام لیا جاتا تھا اور ہوائی جہاز بمباری کیا کرتے تھے، بلوچ شاعر
بہادروں کو تلواروں، خنجروں اور تیروں سے مسلح میدان جنگ میں
روشی کا مظاہرہ کرتے دکھاتے تھے، البتہ رحم علی بجار نے حرب کی لڑائی
انگریزوں کے ہوائی جہاز اڑانے کا ذکر کیا ہے کہیں کہیں توپوں، اور
دوقوں کے استعمال کا بھی ذکر آیا ہے لیکن مورچے سنبھالنے اور چھپ
شمن پر گولیاں چلانے کا بیان کسی شاعر نے بھی نہیں کیا، یہاں تک کہ جیبو
اس ضمن میں دو چار شعر کہنے کے بعد اُسی پرانی روش پر چل کر تلواروں،
خنجروں کی گرم بازاری دکھانے لگتا ہے.

اس لڑائی میں ایرانی سپاہ کی تعداد بہت زیادہ تھی انہوں نے
زوں کے لشکر کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا، بلوچ مورچوں میں چھپ کر

لڑ رہے تھے، تھوڑی دیر تک دونوں طرف سے توپوں کے گولے برس
اور بندوقوں کی گولیاں چیختی چلاتی رہیں۔ بقول جیسو

دیمپدیم بوتنت شیر، گونا ایرانی نران
چرا سدر وارءُ گھڑتنت گڑگی رپھلان
گرندتگ توپان گلزمیں ابتگ لرزگان
دھنر و تھا موران گپتگت کلیں آسمان

یعنی:-

شیر (بلوچ) اور ایرانی بہادر آمنے سامنے آگئے
گڑگی رپھلیں شیر کی طرح غرانے اور توپیں گرجنے لگیں۔
زمین کانپنے لگی۔
اور کالا گرد و غبار آسمان پر چھا گیا،

گڑگی سے مراد رفلیں

بالآخر ایرانی سپاہ نے بلوچوں کے مورچوں پر جھپٹ کر حملہ کر دیا، ایرانی
سپاہ کو حملہ آور دیکھ کر بلوچ بھی اپنے مورچوں سے باہر نکل آئے، ان کا گھوڑ
سوار دستہ لڑائی میں شامل ہو گیا، دو بدو لڑائی کا سماں بندھ گیا، جیسو نے
اس موقع پر دست بدست لڑائی کا جو منظر پیش کیا ہے وہ قابل تحسین ہے
کہتا ہے

شیلکتگ تیگھان، درھکتگ گینڈءِ اسپران
صحبت دچاپے زدت، طلاکاریں خنجران
ہر گورءَ درنا سر شتنت تزندیں مرکبان
بر سر و چکءَ کپتگنت شیریں نوجوان

یعنی:- تلواروں سے شیر تھیں۔

اور گینڈے (کے کھال) کی ڈھالوں سے
دھک دھک کی آوازیں آنے لگیں
طلا کار خنجر ناچ ناچ کر جسموں سے صحبت کرنے لگے
ہر طرف شوخ گھوڑوں پر سے
شیر جیسے بہادر نوجوان ایک دوسرے کے اوپر گرتے رہے

اس لڑائی میں جرنیل باقر خان ایرانی فوج کا سپہ سالار تھا، میر قادر بخش جو ایک بلوچ نوجوان کی نظر اس پر پڑی۔ دیکھتے ہی عقاب کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔

قادر بخش خان بوتگ چو کہ زہیل ءِ گشتان
بیستہ سالارءَ گوں دچار، شیر بچیں جوان
چو رکاب بال ءَ کیتہ من گرانیں سنگران
پہ حسد شیرءَ دزھنت تگ پستول ناگہان
چو قصاب چارگ ءَ جنگ جرنیل باقر خان
طہران و توران و مشہد کرتگ ماتمان!
دُہ دگر گاڑیتگ چما شاہ ءِ معتبران
قادر بخش خان اِش لبتہ گوں تیر و خنجران
تگی بالاءَ شہید بوتگ در زمان
نام خداداد ءِ نوک کتگ کلیں عالمان

قادر بخش خان نے جو زخمی ہاتھی کی طرح جوش کھا رہا تھا۔
اور شیر جیسا ایک بہادر نوجوان تھا،

(ایرانی) سپہ سالار کو دیکھ لیا،
اور پھر عقاب کی طرح اُڑ کر اس کے مضبوط مورچے میں
اس شیر نر نے غضبناک ہو کر
پستول سے اُس پر اچانک گولی چلا دی
جرنل باقر خان کو اس نے اس طرح کاٹ کر رکھ دیا،
جسطرح قصائی اپنے چھریوں سے کاٹتے ہیں۔
(جرنیل باقر خان کو مار کر)
اُس نے طہران، توران اور مشہد کو ماتم میں ڈال دیا
بادشاہ کے افسروں میں سے
اس نے دس اور بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے
اب انہوں نے قادر بخش خان کو
گولیوں اور خنجروں پر رکھ دیا،
جُھوم جُھوم کر چلنے والے اپنے قد و قامت سے گر
وہ نوجوان شہید ہوا۔
بے شک اس نے تمام دنیا میں
خداداد کا نام زندہ کر دیا،

رحم علی بجار کے بعد جیبو ہی اس دور کا دوسرا رزمیہ گو شا
متقدمین اور متوسطین کی قائم کردہ رزمیہ شاعری کے اقدار پر پو
اسکی نظم ابتدا سے انتہا تک ایک شہسوار کی گھوڑی کیطرح اچھلتی
سرپٹ دوڑتی رہتی ہے۔ اور اگر کہیں ٹھوکر کھاتی ہے تو وہ شہسوار
بلکہ اُن انجان سائیسوں کی ہے جو اس راہوار سبک گام کو کوتل کر

پہنچا چکے ہیں۔

اس لڑائی میں ایرانی سپاہ کے کئی بڑے بڑے افسر کام آئے شاعر کو چونکہ ان کے نام معلوم نہیں تھے اس لئے ان کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ سردار دوست محمد خان باران زئی کی طرف سے جو نامور بلوچ شہید ہوئے اُن کے نام گنواتے ہوئے کہتا ہے ا۔

من شہیدانی صاتر ءَ چنت گال گوشان
قادربخش خان ءَ زیب دنت توصیف دبیان
دمبدم یات ءَ کئیت منی میرین براہیم خان
عیدو سرخیل کپتہ چہ سانڈی دریگان
چندنین زین ءَ سرنگون بوتگ یوسف خان
سردار ملک بیگ سرشتگ رکھش ءِ مہیران
سرتی شیران داتہ پہ تیگھانی رھان

ا۔ ترجمہ:

اب میں شہیدوں کے لئے کچھ تعریفی اشعار کہوں گا،
قادربخش خان تعریف و توصیف کے لائق ہے۔
میر براہیم خان بار بار مجھے یاد آتا ہے۔
عیدو سرخیل جواب اپنی سانڈھنی بلبلاہٹ سے رہ گیا ہے۔
یوسف خان جو اپنے گھوڑے کی چندلی زین سے سرنگون ہوا۔
سردار ملک بیگ جو اپنے رخش (گھوڑے) کے
گیسوؤں جیسے ایال کے اوپر سے سر کے بل گرا
یہ سب نوجوان تلوار بدست میدان جنگ میں کام آئے۔

آخر میں بلوچوں کی شکست اور قتل عام پر افسوس کرتے ہوئے جیئو کہتا ہے:۔

عاقل و دانایان کنہت چنداں ہوش وسار
نوبتِ دُنیاءِ نہ بیت ہچ کس ءَ مدار
زیادگیں زوراں پرشتگنت مات بند و حصار

یعنی

اے عاقلو اور داناؤ!
اب زیادہ ہوش اور سمجھداری سے کام لو
دنیا کی یہ خوشیاں
کسی کے ساتھ پائدار نہیں رہ سکتیں
تم نے دیکھ لیا کہ بڑی طاقتوں نے
کس طرح تمھارے سلسلہائے کوہ
اور قلعوں کو توڑ کر رکھ دیا۔

اس لڑائی میں شکست کھاکر سردار دوست محمد باران زئی گرفتار ہوئے اُسے طہران لے جایا گیا اور وہاں پر کچھ عرصہ بعد رضا شاہ کبیر کے حکم سے اُسے گولی ماردی گئی، لیکن مشہور یہ کیا گیا کہ طہران سے بھاگنے کی کوشش میں وہ مارا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

بلوچی رزمیہ شاعری کی یہ داستان یہاں پر ختم ہوئی لیکن بلوچوں کی رزمیہ شاعری ختم نہیں ہوئی وہ بدستور پھلتی پھولتی اور آب و تاب سے آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ بلوچوں کی قومی جدوجہد جیسے جیسے رنگ بدلتی جائے گی ویسے ویسے بلوچی رزمیہ شاعری بھی رنگ بدلتی اور مزید پختگی اور جانداری

حاصل کر لی جائے گی۔

بلوچ قوم اپنی ملی تاریخ میں بڑے بڑے بادشاہوں اور فاتحین کا تختۂ مشقِ ستم بنی رہی ہے۔ بلوچ جانبازوں نے بارہا اپنے خون کی ہولی کھیل کر اپنے گھر بار، مال و مویشی لٹا کر اپنی سرزمین اور اس کی آزادی کیلئے قربانیاں پیش کی ہیں۔ اس لئے اعلیٰ مقصد کے حصول کی جدوجہد میں رزمیہ شاعری ایک کارگر ہتھیار کا کام دیتی رہی ہے اور اس ہتھیار سے بلوچ اپنی تاریخ کے ہر دور میں کام لیتے رہے ہیں۔

اس لئے ہمارا یہ کہنا صحیح ہے کہ جب تک بلوچی کی ان رزمیہ نظموں کی آب وتاب اور آتش بیانی باقی رہے گی، بلوچوں کے جذبۂ قوم پرستی اور سرفروشی میں کمی نہیں آئے گی۔ انشاء اللہ

گل خان نصیر
سنٹرل جیل مچ
جمعرات، ۲؍دسمبر ۱۹۷۳ء

تمام ہوئی،